اگست، ستمبر ۹۶ء

ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲- ایمپریس روڈ - لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد: ۵	اگست، ستمبر ۱۹۸۶ء مطابق ذی الحجہ، محرم الحرام ۱۴۰۷ھ	شمارہ ۶/۷

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بیری، شاہراہ لیاقت، کراچی (فون: ۲۱۶۵۸۶)

سالانہ زرِ تعاون: ۳۰ روپے —————— فی شمارہ: ۳ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

مضمون نگار حضرات کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

فہرس

حکم و عبد ——— ۳
متاع خلوص، جس کے بغیر کوئی عقدہ حل نہ ہوگا۔
مولانا محمد سعید الرحمن علوی

ہدایت القرآن ——— (۹) ——— ۱۱
مولانا محمد تقی امینی

درس قرآن ——— ۲۲
سورہ محمد (تفسیری قسط)

مولانا آزاد - بحیثیت مفسر قرآن ——— ۴۱
مولانا خلاق حسین قاسمی

حضرت مجدد الف ثانیؒ ——— ۴۵
برعظیم پاک و ہند میں باب تجدید کے فاتح (آخری قسط)
مولانا محمد سعید الرحمن علوی

رقت و رحمت کا پیکر مجسم ——— ۶۳
مولانا الطاف الرحمن بنوی

رسول اللہ اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔ (قسط ۳) ۷۰
عبد القادر جیلانی

سیرت و سوانح ——— ۹۰
حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ (قسط ۷)

تعارف و تبصرہ ——— ۱۰۰
(ادارہ)

حکم و عبر

متاعِ خلوص

جس کے بغیر کوئی عقدہ حل نہ ہو گا۔

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

راقم ۱۹۸۰ء میں ایک بڑے قافلہ میت مسلمانوں کے عظیم الشان علمی ادارہ دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں ہندوستان گیا تو دل میں ایک خیال تھا کہ اس وسیع و عریض ملک میں اہل علم اور اہل دل کی بستیاں ضرور دیکھوں گا ـــــ لیکن مختصر وقت، قانونی مشکلات اور دوسرے عوامل نے اس کا موقع فراہم نہ کیا۔ پھر بھی اجتماعِ دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ایک چند نفری قافلہ کے ساتھ جس میں میرے بڑے بھائی اور محسن مولانا عزیز الرحمٰن خورشید وغیرہ شامل تھے ـــــ کم از کم سہارنپور، مظفر نگر، دہلی کے اضلاع میں بہت سے مقامات میں نے دیکھ لیے۔ ان مقامات میں اصل دیکھنے کی بات یہ تھی کہ یہ اہلِ قلوب جو ان مقامات میں محوِ خواب ہیں، انہوں نے مسلمان قوم کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے سلسلے میں کس طرح کام کیا اور کیا رول ادا کیا۔

دیوبند سے ہم سہارنپور آئے، یہاں کا عظیم مدرسہ مظاہر العلوم، دیوبند کے مدرسہ عربی کے چھ ماہ بعد قائم ہوا۔ وقت کے بڑے بڑے فضلاء نے اس کو آباد کیا۔ اور اس میں اپنی زندگی کے قیمتی شب و روز گذارے۔ آخر کا دور حضرت محدّث عصر مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔ جو اس وقت بغرض ہجرت مدینہ منوّرہ زادہا اللہ تعالیٰ شرفاً وتعظیماً میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے نفس کی گرمی چار سو موجود تھی۔ ان کے فعّال و متحرک اور صاحبِ علم و قلم نواسے برادرِ گرامی اور محبِ محترم مولانا محمد شاہد نے ہمارے لیے سواری کا انتظام کر دیا اور ہم سب سے پہلے رائے پور گئے۔

رائے پور نام کی دو بستیاں ہمارے علمی و روحانی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ ایک مشرقی پنجاب کے مشہور ضلع جالندھر میں واقع ہے۔ تو دوسری یوپی کے سرحدی ضلع سہارنپور میں۔

جب حضرت والا کے رائے پور کا مدرسہ رشیدیہ آج سامیوں جیسے اہم شہروں اپنی حیثیت مستعار کی پون صدی گزار کر بھی زندگی کے سانس لے رہا ہے تو سہارنپور کی بستی رائے پور کے حوالے سے اہل صلاح و تقویٰ کا ایک عظیم الشان حلقہ اس وقت بھی نہ صرف پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں موجود ہے بلکہ یورپ و عربستان تک اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس دوسرے رائے پور کی آبادی بالکل برائے نام ہے، چھوٹا سا قصبہ، لب نہر واقع ہے، زندگی کی ہماہمی برائے نام، دنیا کی راحت کے سامان نہ ہونے کے برابر، لیکن اس مختصر سی بستی میں بیٹھ کر اہل صلاح کے ایک طبقہ نے جو کام کیا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

○ ● ○

حضرت الامام الشاہ ولی اللہ دہلوی کا مدرسہ و مسجد جب انگریزی استبداد کا شکار ہوئے تو ان کی علمی و روحانی وراثت کا سلسلہ ادھر ادھر پھیل گیا جن میں سے ایک مرکز سہارنپور کی بستی گنگوہ تھا جس میں حضرت مولانا رشید احمد قیام پذیر تھے جنہوں نے دلی کالج میں استاذ العلماء مولانا مملوک علی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسب فیض کرنے کے علاوہ ولی اللہی خاندان کے آخری اساتذہ سے استفادہ کیا ـــــ ان کا روحانی تعلق حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے تھا جو دو واسطوں سے امیر المومنین، مجاہد کبیر حضرت السید احمد بریلوی قدس سرہ کے سلسلہ سے متعلق تھے اور جنہیں سید صاحب نے اپنے دورہ سہارنپور کے زمانہ میں گود میں لے کر دعائے برکت دی تھی ـــــ مولانا گنگوہی نے اپنے رفقاء مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کی معیت میں اپنے شیخ حاجی صاحب کی قیادت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملاً حصہ لے کر "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" اور فرسان بالنہار و رہبان باللیل کی تاریخی حقیقت کو عملاً دھرایا تھا ـــــ ان سے جن حضرات نے کسب فیض کیا ان میں ایک اہم ترین نام حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو فی الحقیقت رائے پور کی خانقاہ کے مؤسس اور ایک مجاہد فی سبیل اللہ ہی نہیں مجاہدین کے سرخیل تھے ـــــ ہم نے خانقاہ کی مسجد سے متصل ایک سادہ سی قبر دیکھی جس کے ساتھ اور قبریں بھی تھیں، یہی شاہ صاحب کی قبر تھی۔ کچی قبر، اس پر کوئی گنبد نہ عمارت، دیا نہ بتی، لیکن قبر کی مٹی بتلا رہی تھی کہ میرے اندر جو آسودہ خواب ہے وہ ایک گوہر یکتا ہے ـــــ ہمیں رہ رہ کر وہ عظیم الشان مقبرے اور گنبد دار عمارتیں نظر آ رہی تھیں جو مسلم تہذیب کا ایک حصہ بن گئی ہیں اور اب تو کبھی کبھی ہر جاہلی زندگی کے حامل کی قبر ایسی ہی رہی ہے جس پر توہم پرست

مرد و خواتین سجدے کرتے ... چادریں چڑھاتے ... نذرانے دیتے ہیں اور توفیق خیر سے محروم ... اہلِ علم و اہلِ سلوک اور حکومتی حلقے ٹس سے مس نہیں ہوتے ۔

اللہ رب العزت خوب جانتے ہیں کہ اس سادہ ... اور کچی قبر کے پاس مسنون طریقے سے ایصالِ ثواب کرتے ہوئے ہمارے قلب میں عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے اور تاریخ کا ایک باب مستقلاً سامنے کھلا نظر آ رہا تھا ۔ اور جب ہم قبر سے ہٹ کر مسجد کی دوسری طرف چند مختصر حجروں پر مشتمل ایک عمارت میں گئے اور وہاں ایک بہت ہی مختصر کمرہ دیکھا جس کی چھت اتنی پست تھی کہ اس میں قد کا آدمی صحیح طریق سے کھڑا نہ ہو سکتا تھا تو پتہ چلا کہ یہی کمرہ ہے جس میں شاہ صاحب کا قیام ہوتا ——— شاہ صاحب اور ان کے بعد ان کے جانشین حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کمرے میں بیٹھ کر کیا کیا معرکے سرانجام دیئے یہ ایک مستقل داستان ہے ۔

حضرت امام مولانا محمود حسن المعروف شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی مشہور عام تحریک ریشمی رومال میں شاہ صاحب رائے پوری کا مؤثر حصہ تھا ۔ وہ دور تاریخ کا عجیب دور تھا ۔ ایک طرف خانقاہ نشین صوفیا کی ایک جماعت برطانوی استبداد سے ٹکرا رہی تھی تو دوسری طرف "پیرانِ عظام" کا ایک طبقہ انگریزی سطوت کو سلام کرنے کی غرض سے مارشل لاء ۱۹۱۹ء کے ہیرو اور پنجاب کے ظالم گورنر جنرل اڈوائر کو لاہور میں سپاسنامہ پیش کر رہے تھے ۔

شیخ الہند جو دیوبند کے مدرسہ کے صدر مدرس تھے ان کا خود روحانی تعلق گنگوہ سے تھا تو شاہ عبد الرحیم رائے پوری بھی وہیں کے خوشہ چین تھے اور واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کا ابتدائی خاکہ رائے پور کے اس نیم پختہ مختصر کمرہ میں بنا اور شیخ الہند نے اپنی عدم موجودگی میں شاہ صاحب کو تمام معاملات کا نگران قرار دیا ——— پھر اس تحریک سے وابستہ مشائخ میں قادری سلسلہ کے دو اہم بزرگ تھے ۔ میری مراد حضرت میاں غلام محمد دین پوری اور حضرت مولانا تاج محمود امروٹی قدس سرہما سے ہے جو امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا احمد علی لاہوری رحمہما اللہ تعالیٰ کے مربی تھے ——— بہرطور بات تھی رائے پور کی ۔ کہ اس شہری آبادی اور شہری ہنگاموں سے الگ تھلگ ایک بستی کے نیم پختہ کمرے میں اس تحریک کا تانا بانا بنا گیا اور پھر مولانا سندھی کو کابل بھیجا گیا ——— افسوس کہ ترکی خلافت کی تباہی کے درپے شریف مکہ (موجودہ شاہ اردن کے پردادا) اور بعض ہندی احباب نے شیخ الہند سے لے کر مولانا

سندھی تک سب کے سب مشکلات پیدا کردیں۔ کسی کو گرفتار ہونا پڑا تو کوئی روپوش ہوا اور اس طرح یہ تحریک ابھرنے سے قبل ہی حوادث کا شکار ہوگئی۔

رائے پور کے اسی حجرہ میں مشہور عالم تبلیغی جماعت کے متعلق سوچ بچار ہوئی جس کے ذریعہ آج پوری دنیا میں ایمان ویقین کی ایک لہر اپنی موجیں دکھارہی ہے اور اسی حجرہ میں برعظیم کے ایثار پیشہ مخلص کارکنوں کی جماعت مجلس احرار اسلام کا تانا بانا بنا گیا جس نے برطانوی سامراج کے ساتھ ساتھ اس کے خود کاشتہ پودے قادیانیت کی جڑیں کھوکھلی کردیں۔

ہمارے محترم کرم فرما مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا رائیپوری قدس سرہٗ کی سوانح مرتب کی ہے جس کا ایک باب اس بستی کے شب وروز پر مشتمل ہے ـــــ اس باب میں مولانا نے برعظیم میں خانقاہی نظام کے گہرے اثرات کے ساتھ ساتھ خاص اس خانقاہ کے شب و روز کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اسے پڑھ کر ہر دل پر ایک اثر ہوتا ہے ـــــ اور اس کا تیرھواں باب اس عنوان پر مشتمل ہے۔

"خاموش دینی خدمات، تحریکوں کی سرپرستی و رہنمائی اور کارکنوں کی ہمت افزائی"

یہ باب اس قابل ہے کہ ہمارے دور کے علماء، صلحاء، اہل سیاست، قائدین اور ہر نوع کے ذمہ داروں کو اسکا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ انہیں اندازہ ہوسکے کہ خلوص و تقویٰ کی دولت کے بغیر دنیا کا کوئی کام سرانجام نہیں پاتا اور حوصلہ افزائی کے بغیر کوئی جماعت و تحریک نہیں پنپتی۔

ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس دور میں دین اسلام کا اتنا شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، "اہل طاقت" سے لے کر "اہل دل" تک سبھی ایک ہی شور مچا رہے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ مسائل برابر بڑھ رہے ہیں، شرافت کا جنازہ اٹھ رہا ہے اور حالات کی سنگینی روز بروز بڑھ رہی ہے۔

آج دین کے نام پر اور خدمت کے عنوان سے اداروں، تحریکوں اور جماعتوں کو شمار کریں تو معاملہ کہیں سے کہیں جا پہنچے گا۔ اس کے ساتھ ہی مادی وسائل کے حوالہ سے کنالوں نہیں ایکڑوں میں پھیلے ہوئے مدارس و دفاتر، پختہ عمارات پر مشتمل خانقاہیں، ان کے دروازوں پر ایستادہ نئے نئے ماڈل کی کاریں اور بہت کچھ نظر آئے گا۔ لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود حالت یہ ہے کہ انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ اور تاریکی بڑھ رہی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دولت خلوص و اخلاص رخصت ہوگئی، اصلاح کے لئے نبوی طریق

آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ہم لوگ دفاتر و عمارات کی پختگی ہی پر کر یہ سوچنے لگے ہیں کہ خیر کے سبھی چشمے اسی سے پھوٹیں گے کہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر شعبہ زندگی کے قائدین کا معاملہ ایسا ہو چلا ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانی سطح سے بلند سمجھنے لگے ہیں ـــــ ان کے نزدیک ان کی عقل ہی عقل کل ہے تو سلامتی قلب کی اجارہ داری بھی انہی کے پاس ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بارگاہ میں کسی کارکن، معاون اور بہی خواہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جب تک مخلص رکر ہاں میں ہاں ملاتے رہیں وہ رہنماؤں کی آنکھ کے تارے ہیں، جب ذرا سا اختلاف کیا تو گردن زدنی قرار پائے ـــــ ہر اجتماعی قوت افراد کے گرد گھومتی ہے اور جب وہ فرد حیات مستعار پوری کر کے رخصت ہوتا ہے تو جماعت کا تاج محل زمین بوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں کسی خیر و بھلائی کی توقع ہو تو کیوں کر ؟

ہم نے اپنی حیات مستعار کے کامل ۱۸ برس دشت سیاست کی صحرا نوردی میں بسر کئے رہنماؤں کے شب و روز دیکھے، کارکنوں کا خلوص دیکھا۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ورکر جتنا مخلص ہے، رہنما اتنا ہی خود غرض ہے، وہ ساری دنیا کے محاسبہ کی بات کرے گا لیکن اپنے محاسبہ پر چیں بجبیں ہو کر رہ جائے گا۔ وہ جمہوریت کا علمبردار ہوگا لیکن عملاً بدترین آمر، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلام اور دین فطرت کا صبح و شام ورد کرے گا لیکن اس کی اپنی زندگی روح دین سے خالی ہوگی۔

سوچتا ہوں کہ یہ ارباب بصیرت و عزیمت اور بندگان بارگاہ الست نہ ہوتے تو کیا ہوتا ـــ! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے نظام کو چلانا تھا، اس نے جملہ اہتمام کئے اور بقول شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ :

انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے بنیادی اہداف تین ہیں :
مبداً و معاد وغیرہ کے متعلق عقائد کی تصحیح ـــ عبادات و معاملات اور معاشرت وغیرہ انسانی اعمال کی صحیح صورت اور تیسرے اخلاص و احسان ـــــ یہ تیسری چیز دین میں سب سے بڑھ کر عمیق و دقیق ہے اور نظام دین میں اس کی حیثیت وہی ہے جو جسم میں روح کی۔

پر افسوس کہ آج یہی روح مردہ ہے، آج اخلاص و احسان کا تذکرہ تو ہے لیکن اس کی حقیقت کہیں نظر نہیں آتی محض ایک ہنگامہ ہے اور ایک شور ہے اور حال یوں نظر آتا ہے کہ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل ، وہ دکان اپنی بڑھا گئے ۔

آج ملکی سطح پر ، قومی سطح پر ، جماعتوں کی سطح پر ہر طرف مسائل کا انبار ہے ، حالات کی سنگینی کا گلہ ہے اور ظلم و ستم کی گرم بازاری کا رونا ــــ لیکن کیا رونا اور گلہ کرنے سے حالات درست ہو جائیں گے ، ہرگز نہیں ۔ اس کے لئے ضرورت ہے ، اس اخلاص و احسان کی ــــ جسے امام ولی اللہؒ نے دین کی روح سے تعبیر کیا اور ایک انہی پر کیا منحصر ہے ۔ تاریخ اسلام کی ہر بڑی شخصیت نے یہی کہا ۔ اللہ کے رسول ﷺ نے یہی فرمایا اور خود اللہ نے یہی فرمایا :

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ

جب تک ہم اپنے اعمال حیات میں دولت خلوص پوری طرح اجاگر نہ کریں گے ہمارا کوئی کام سیدھا نہ ہوگا کیونکہ سنت الٰہی یہی ہے ۔ اور سنت الٰہی تبدیل نہیں ہوتی ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس دولت بے کراں سے حصہ وافر عطا فرمائے ۔

آمین بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

○

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکام پاکستان

اشاعت خاص ۲۰/- روپے

اشاعت عام ۱۲/- روپے

قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست درج ذیل پتہ پر لکھیں

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۸۵۲۶۱۱ :فون

پاکستان کیوں بنا ــــ کیسے بنا

پاکستان کیوں ٹوٹا ــــ کیسے ٹوٹا

اب ٹوٹا تو ــــ

پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن

لفظ لفظ میں ــــ وطن کی محبت

سطر سطر میں ــــ ایمان کی چاشنی

عمل کا پیغام ــــ

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا
- وہ آج بھی قاتل خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟

تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

① **سانحہ کربلا**: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

② **شہیدِ مظلوم**: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت صرف -/۹ روپے (سستا ایڈیشن -/۴)
قریبی بکسٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون نمبر: ۸۵۲۶۸۳

(Saeed)

آپ کے احباب کے لیے :

بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مُسلمانوں پر
قُرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتہً پیش کیجیے۔

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی اور فارسی ترجمہ شائع ہو چکا ہے
اس کے حقوق اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ
ہیں نہ انجمن کے!

مرکزی انجمن خُدّام القُرآن ——— لاہور

ہدایت القرآن ۸ (۹)

قرآن کی بنیادی تعلیم:

محمد تقی امینی

اوپر تین گروہوں کا بیان تھا جن سے کتاب ہدایت (قرآن) کو سابقہ پیش نے والا ہے۔ ان کے تعارف کے بعد اب اصول اور بنیادی تعلیم کا ذکر ہے جس کے رد قرآن کی فکری و عملی زندگی گردش کرتی ہے وہ ہیں۔

(۱)۔ توحید (۲)۔ رسالت اور (۳) آخرت۔

(۱) توحید ایک اور صرف ایک اللہ پر ایمان لانا اور اسی کی فرماں برداری کرنا۔

(۲) رسالت۔ اللہ کے رسولؐ پر ایمان لانا اور اسی کے بتائے ہوئے طریقے اور راستے (صراطِ مستقیم) پر چلنا کہ اسی میں اللہ کی فرماں برداری ہے۔

(۳) آخرت۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اللہ کے سامنے جوابدہ ہونے پر یقین رکھنا۔

قرآن نے انسان کی اندرونی زندگی کا جو حال بیان کیا ہے اس کے لحاظ سے ان تینوں پر ایمان اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی کو تعلیم کے ذریعہ اندر سے ابھارا جاتا ہے۔ اوپر سے مسلط نہیں کیا جاتا، یعنی انسان کی پیدائش کے وقت ان تینوں کے نقوش فطرت میں پیوست کر دیتے جاتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اس طرح فطرت اور تعلیم میں مطابقت پیدا ہوتی ہے۔

قرآن نے انسان اور اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کی جو تاریخ بیان کی ہے اس کے لحاظ سے بھی ان تینوں کی تعلیم نئی نہیں ہے بلکہ اسی وقت سے دی جاتی رہی ہے جب سے دنیا میں انسان آیا اور جب سے ہدایت بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان اور اللہ کی ہدایت کے درمیان کوئی وقفہ یا فاصلہ

رہا ہو یعنی انسان رہا ہو اور اللہ کی ہدایت نہ موجود رہی ہو، یا انسان تنہا آیا ہو اور ہدایت بعد میں آئی ہو۔ جیسا کہ اگلے رکوع میں انسان اور ہدایت دونوں کی ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ساتھ ہی اس وقت کی ابتدائی زندگی کے لحاظ سے ابتدائی ہدایتوں کو ساتھ لایا تھا جس میں توحید، رسالت اور آخرت تینوں شامل تھے۔

دنیا اتنی تحقیق کے بعد اب اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ انسان کا قدیم ترین عقیدہ توحید رہا ہے۔ شرک کا عقیدہ بعد میں آیا ہے۔ یہ نتیجہ بجائے خود قرآن کی بتائی ہوئی انسان کی فطرت اور اس کی ابتدائی تاریخ کی سچائی کا کھلا اعلان ہے۔

توحید کا ثبوت :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

اے لوگو![1] تم اپنے اس رب کی عبادت کرو[2]، جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی، جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی ہو جاؤ[3]۔ وہی رب (پروردش کرنے والا) جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت بنایا اور بادل سے پانی برسایا، پھر اس نے تمہاری روزی کے لئے پھل نکالے پس تم کسی اور کو اللہ کا شریک نہ بناؤ جب کہ تم جانتے ہو کہ یہ سب اسی نے کیا ہے،[4]

[1] خطاب تمام انسانوں کے لئے ہے کسی خاص گروہ و فرقہ کے لئے نہیں ہے اور انداز بھی وہی اختیار کیا گیا ہے جو تمام نبیوں اور رسولوں کا رہا ہے۔ سبھی نے پہلے اُعْبُدُوا اللّٰہَ (اللہ کی عبادت کرو) ہی فرمایا تھا۔

[2] عبادت کی وضاحت سورۃ فاتحہ میں گذر چکی ہے کہ اس کی حقیقت اللہ کی عظمت و بڑائی کے سامنے انتہائی محبت و دل کی لگن کے ساتھ انتہائی عاجزی و ذلت کا اظہار ہے آیت میں عبادت کی یہی حقیقت مراد ہے۔ اللہ بندہ کا صرف آقا و حاکم ہی نہیں ہے بلکہ محبوب و من موہن (دل کا پیارا) بھی ہے۔ اس بنا پر محبت عبادت کی حقیقت میں داخل ہے جو عبادت محبت کے بغیر ہوگی اس میں صرف ضابطہ کی خانہ پری ہوگی اور رابطہ کا تعلق نہ پیدا ہوگا اس میں قانون کی خشکی ہوگی محبت کی چاشنی سے محرومی ہوگی۔ جب کہ اللہ کو مطلوب وہ عبادت ہے جس میں محبت کی

چاشنی ہو اور دل دھیان سے اللہ کی فرمانبرداری ہو۔

عبادت کی بے شمار شکلیں اور صورتیں ہیں ہر وہ کام اور بات عبادت ہے جس سے اللہ راضی ہو اور جو اللہ کو پسندیدہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ کام اور بات عبادت ہے جو اپنی ذات، گھر والوں، رشتہ داروں کو اور اللہ کے دوسرے تمام بندوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے یا نقصان سے بچانے کے لئے ہو۔ اس طرح عبادت کے دائرہ میں انسان کی پوری زندگی آجاتی ہے اور زندگی کے تمام حالات و معاملات سے اس کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ پوجا ایک خاص رسم ہے جس کا حق دار نہ معلوم کس کس کو سمجھا جاتا ہے اور جس کا تعلق زندگی کے تمام حالات و معاملات سے نہیں قائم ہوتا ہے پھر جس کی پوجا کی جاتی ہے اس کی طرف سے کچھ کرنے یا چھوڑ دینے کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا ہے کہ جس سے اس کی رضامندی و ناراضگی کا پتہ چل سکے، اسی بنا پر عبادت کا ترجمہ پوجا کرنا یا اس کے ساتھ تشبیہ دینا صحیح نہیں ہے۔

۳ عبادت کا فائدہ تقویٰ حاصل کرنا بتایا گیا ہے یعنی اندر جو روحانی کیفیت (دل کی روشنی) ہے وہ ابھر آئے اور پھر قرآن سے ہدایت لینے میں دشواری نہ رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت کی حقیقت کو اندر کی فطری حالت ابھارنے، اس کو پروان چڑھانے اور پھر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے قابل بنانے میں خاص دخل ہے۔

۴ عبادت کا حق دار صرف اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے اس کے ثبوت میں اللہ کی تین صفتیں ذکر کی گئی ہیں۔

۱۔ وہی تمہاری پرورش کرتا ہے۔

۲۔ وہی تمہیں پیدا کرتا ہے۔

۳۔ وہی تمہارے زندہ رہنے کا انتظام کرتا ہے۔

(۱) پرورش کی صفت اللہ کی محبت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے بغیر کوئی کسی کی پرورش نہیں کرتا ہے۔

(۲) پیدائش کی صفت اللہ کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے بغیر کوئی کسی کے سامنے نہیں جھکتا ہے۔

(۳) انتظام کی صفت قدم قدم پر انسان کی محتاجی ظاہر کرتی ہے کہ اس کے

بغیر عظمت کے سامنے بھی کوئی جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

پروردگار کی صفت میں پیدائش کی صفت شامل نہ تھی اس لئے اس کو علیحدہ سے ذکر کیا کہ بات صرف پروردگار پر نہیں ختم ہوتی بلکہ تم کو اور تمہارے باپ دادا کو پیدا بھی اسی نے کیا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ اس زمین و آسمان کو تمہارے رہنے کے قابل اسی نے بنایا ہے اور تمہارے زندہ رہنے کے لئے ہر قسم کے رزق کا انتظام بھی وہی کرتا ہے۔

پس جو ذات پروردگار، پیدائش اور انتظام سب کچھ کرتی ہے وہی اور صرف وہی عبادت کی حق دار ہے اور جس کا ان سب میں کوئی شریک نہیں ہے تو اس کی عبادت میں کسی اور کی شرکت کیوں کر ہو سکتی ہے؟ جب تم ان تینوں کو خالص اللہ ہی کی طرف سے جانتے ہو کسی اور کو شریک نہیں مانتے تو پھر عبادت میں کسی اور کو شریک کرنا کیسے گوارا کرتے ہو۔

رسالت کا ثبوت

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول تھے، اس کے ثبوت میں قرآن نے دو باتیں پیش کی ہیں۔

(۱) ایک خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور (۲) دوسری وہ کتاب (قرآن) جو ہدایت و رہنمائی کے لئے آپؐ نے پیش کی ہے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں آپؐ ہی کی زبان سے کہلوایا گیا کہ "میں عمر کا بیشتر حصہ تم میں گذار چکا ہوں (یونس آیت ۱۶) میری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح تم سب کے سامنے ہے۔ ہر شخص دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی کمی اور قصور نہیں ہے بلکہ دوسرے تمام انسانوں کی زندگی سے کہیں بلند و برتر ہے، میری زندگی کے بارے میں یہ تجربہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ میں کوئی بات اپنی خواہش کے تحت اپنے اقتدار اور فائدے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اللہ کی بات اس کی مرضی کے مطابق لوگوں تک پہنچا رہا ہوں۔

(۲) کتاب (قرآن) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے اللہ کی طرف سے ہونے میں تمہیں کسی قسم کا شک و شبہ ہے تو اس کا مقابلہ کر کے دیکھو، اس جیسی کوئی چھوٹی

سی چھوٹی سورت بنا کر لاؤ اور تنہا نہیں بلکہ جتنے تمہارے حمایتی اور مددگار ہوں ان کو بھی اس مقابلہ میں اپنے ساتھ بلا لو پھر فیصلہ کرو کہ کیا یہ کسی انسان کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔

یہ دونوں ثبوت اتنے مضبوط اور پائدار ہیں کہ رہتی دنیا تک باقی رہیں گے اور نہ ان میں کمی آئے گی اور نہ ختم ہوں گے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

اور اگر تم لوگ[1] اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے[2] تو ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت اس جیسی تم بھی لے آؤ اور اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے مقابلے میں بلا لو اگر تم سچے ہو[3]

[1] پہلے کی طرح یہ خطاب بھی تمام انسانوں کے لئے ہے کسی خاص قوم یا زمانہ کے لئے نہیں ہے اور مقابلے کے لئے دعوت بھی کسی ایک پہلو سے نہیں ہے۔ بلکہ زبان، انداز بیان، معانی، مطالب، مقاصد، مفہوم میں گہرائی اور وسعت ہر پہلو سے ہے۔

بلاشبہ قرآن میں عربی زبان کے نہایت اعلیٰ درجہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جملوں میں نہایت اعلیٰ درجہ کی ترکیب استعمال کی گئی ہے لیکن ان الفاظ اور جملوں میں جو معانی مطالب اور مقاصد پوشیدہ ہیں ان میں جس قدر گہرائی اور وسعت ہے پھر ان کے لئے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ سب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہیں اور ان سب سے مقابلہ کے لئے تمام انسانوں کو دعوت دی گئی ہے۔

[2] قرآن کوئی نئی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی ہے۔ سب سے پہلے انسان (آدمؑ و حواؑ) تنہا نہیں آئے بلکہ اللہ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی بھی اپنے ساتھ لائے، پھر ان کی اولاد میں بھی ضرورت اور وسعت کے لحاظ سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ قرآن کی شکل میں اسی ہدایت و رہنمائی کا آخری ایڈیشن آگیا۔

ہدایت و رہنمائی کی ابتدا سے قرآن کے زمانہ تک کا وقفہ کچھ کم نہیں

ہے بلکہ بہت زیادہ ہے ۔ اس عرصہ میں اس کو مختلف طبیعتوں مختلف حالتوں اور مختلف فضاؤں سے سابقہ پیش آتا رہا ہے جس سے طبیعت کو ہموار کرنے اس کو مضبوط بنانے اور فضا کو قابلِ قبول بنانے میں بڑی مدد ملی ۔ پھر یہ مجموعہ (قرآن) ایک دم سے نہیں آ گیا بلکہ مختلف وقتوں میں، مختلف حالتوں کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا آتا رہا اور موقع و ضرورت کے مطابق پہلی شریعتوں میں تبدیلی بھی ہوتی رہی جس سے ہر قسم کے تجربات کے کافی مواقع فراہم ہوئے۔ یہاں تک کہ جب انسان کی طبیعت اس کی استعداد اور دوسرے حالات ساز گار ہو گئے تو ہدایت و رہنمائی کے اسی سلسلے کو قرآن کی صورت میں آخری اور مکمل شکل دے دی گئی۔

سلہ قرآنی ہدایت و رہنمائی کی بنیاد "فطرت" پر ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے معاشرہ اور سوسائٹی پر نہیں ہے جس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے ۔ یوں سمجھئے کہ فطرت ایک پاکیزہ اور صاف ستھرا "بیج" ہے جس پر انسانیت کا درخت اُگتا اور پھل پھول لاتا ہے یہ بیج ہر انسان کی پیدائش کے وقت اس کے اندر پیوست کر دی جاتی ہے ۔ ریسرچ و تحقیق کے کسی دائرہ میں اب تک نہیں آ سکی ہے ۔ اس کی حیثیت اب بھی انکشافِ حقیقت کی (Revelation of Truth) کی ہے جس پر پڑے ہوئے پردے کو اللہ نے اٹھایا ہے انسانی دریافت کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے انسان اپنے بارے میں بہت کم معلوم کر سکا ہے اور جس قدر اس نے معلوم کیا ہے وہ جس ناقص حالت میں ہے جس کا اقرار خود ماہرین کو ہے ۔

قرآن کا اصل میدان انسان ہے اس کے سارے بیانات اسی سے متعلق ہیں، دوسری چیزیں اسی کی کار برآری کے لئے ہیں اور اسی کی کارگذاری میں لگی ہوتی ہیں اس نے جس نظر سے انسان کو دیکھا اور اپنے بیان میں روحانی پاکیزگی، اخلاقی سچائی قانونی تقدس اور تاریخی شرافت کا جس قدر اہتمام کیا ہے، علم و فن کی اتنی ترقی کے باوجود اس کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکی ہے ۔

پھر قرآن کے بیان میں کوئی چیز علیحدہ نہیں ہے بلکہ فکر (عقیدہ) و عمل، ضمیر و اخلاق، تاریخ و قانون سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ملے ہوئے اور روحانی نظام میں اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ کوئی دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتا ہے

اور اگر علیحدہ کر کے دیکھا گیا تو اس کی اصلی حیثیت اور فائدہ مندی نہ باقی رہے گی۔

قرآن کا انداز بیان اصول کی شکل میں ہے اس میں عام قاعدے اور ان کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں انسانوں کے مصالح اور فوائد پر گفتگو ہے اور ہر ایک کے ثبوت میں تاریخی حوالوں کی بار بار شہادت ہے۔ ان کے مطابق زندگی گذارنے اور نہ گذارنے کے آنکھوں دیکھے اثرات اور نتائج کا بیان ہے۔ اس میں جزئی باتیں اور جزئی قوانین بہت کم ہیں اور جس قدر بھی ہیں وہ نمونہ کے طور پر ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ترقی کرنے والی زندگی اور آگے بڑھنے والے معاشرہ و سوسائٹی کے مسائل حل کئے جاتے رہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ انداز بیان اس ہدایت و رہنمائی کے لئے ضروری ہے جو سب کے لئے ہو اور ہمیشہ رہنے والی ہو۔ مان لیجئے اگر اس میں تفصیلات بیان کر دی جاتیں اور ہر ایک کی عملی شکل کے خاکے تیار کر دیئے جاتے تو یہ تفصیلات اور خاکے کسی ایک زمانہ اور کسی ایک قوم کے لئے ہوتے۔ سب کے لئے اور ہمیشہ کے لئے نہ ہوتے، پھر قرآن کی ہدایت و رہنمائی عالمگیر نہ ہوتی اور اس میں وہ کشش نہ پیدا ہوتی جو ہر زمانہ میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝

"پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے"[۱]

[۱] اوپر قرآن کی چھوٹی سی چھوٹی سورت بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی یہ اس سے آگے کا قدم ہے، جس میں مقابلہ کے لئے چیلنج کیا گیا ہے اور حمیت و غیرت کے ابھارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ انداز وہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی میں ذرا بھی ہمت و جرأت ہو تو جان تک لڑانے کے لئے تیار ہو جائے۔

[۲] پھر مقابلہ نہ کر سکنے کی صورت میں دوزخ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے دنیوی عذاب کی دھمکی نہیں دی گئی ہے کہ اس میں کسی نہ کسی طرح زور اور سفارش کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے جب کہ دوزخ کے عذاب میں دنیا کی طرح کسی کے زور اور سفارش کی گنجائش نہیں ہے۔ (آگے زیادہ وضاحت آ رہی ہے)

۳ پھر جن کے زور اور جن کی سفارش پر ناز تھا یعنی پتھر کی مورتیاں، دوزخ کے عذاب میں وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گی جس سے ایک طرف عذاب میں شدت ہوگی اور دوسری طرف حسرت وندامت میں اضافہ ہوگا۔ چیلنج میں ایسے عذاب کی دھمکی مقابلہ میں مزید تیزی پیدا کرتی ہے اور ہر طرح سے دعویٰ کو جھوٹا کر دکھانے اور تحقیق بات پا کر کے چیلنج کا جواب دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ :

اور ان لوگوں کو خوشخبری دیجئے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں[۱] جب انہیں وہاں کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے (دنیا میں) دیا جا چکا ہے اور شکل وصورت میں (مگر مزہ میں) ملتا جلتا ہی پھل دیا جائے گا اور ان کیلئے وہاں صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے[۲]

۱ یہ ان لوگوں کے لئے اجر وانعام کا وعدہ ہے جو ایمان لا کر اچھے کام کرتے ہیں۔ پہلے قرآن سے انکار پر جہنم کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا اب اس پر ایمان لا کر اجر وانعام کی امید دلائی جا رہی ہے۔

ڈرانا اور امید دلانا یہی دو مؤثر ذریعہ اور کارگر ہتھیار ہیں جن کے ذریعہ انسان پر قابو پایا جاتا اور اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔ اگر یہ دونوں کسی معاشرہ میں نہ باقی رہ جائیں تو پھر اسکی آزادی وبے راہ روی پر قابو پانے اور اس کو اچھے کام پر ابھارنے کی کوئی شکل نہیں رہتی ہے۔

قرآن میں دنیوی سزا کے مقابلے میں آخرت کی سزا سے زیادہ ڈرایا گیا ہے اسی طرح دنیوی جزاء کے مقابلے میں آخرت کی جزاء کی زیادہ امید دلائی گئی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دنیا بڑی حد تک انسان کے قابو میں ہے اس کی سزا سے بچنے اور اس کی جزاء کو حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاس ہزار راہیں اور ہزار تدبیریں ہیں جن کو کام میں لا کر وہ سزا سے بچا رہتا اور جزاء حاصل کرتا رہتا ہے۔ آخرت کی سزا اور اسکی جزاء میں ایسا نہیں ہے وہ تمام تر انسان کے قابو واختیار سے باہر ہے۔

پھر دنیوی جزا اور سزا کے قانون کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہاں مقصود دنیا کا نظام چلانا اور اس کو ترقی دیتے رہنا ہے۔ ایسا اوقات اس نظام کی رعایت ایسی ضروری ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے جزا و سزا کے عام قانون کو ملتوی کرنا پڑتا ہے، کبھی خاص فائدہ کے تحت تکلیفوں اور مصیبتوں کے ذریعہ انسان کی آزمائش کی جاتی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی ہے اور دل و دماغ کے آبگینہ کو پتھر سے کچلا جاتا ہے جس کو دیکھ کر سزا کا شبہ ہوتا ہے حالانکہ اپنے کاموں کی بنا پر وہ سزا کا نہیں جزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی طرح خاص مصلحت کے تحت کسی کو آسائش اور انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے جس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا اور جس کو دیکھ کر جزا کا شبہ ہوتا ہے۔ حالاں کہ اپنے کاموں کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

اچھے برے کام پر دنیا میں بھی جزا و سزا کا قانون نافذ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہو، یا اچھے انعام سے ان کو بالکلیہ محروم کر دیا جاتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا اور اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ لیکن چونکہ دنیا میں جزا کی تاخیر اور سزا میں مہلت و ڈھیل کی بیشمار ایسی صورتیں پائی جاتی ہیں جن کو گرفت میں لانا آسان نہیں ہے۔ اسی طرح خاص فائدہ کے تحت تکلیفوں اور مصیبتوں کے ذریعہ انسان کی آزمائش اور خاص مصلحت کے تحت آسائش اور انعام واکرام کی بے شمار صورتیں ہیں جن کو کسی خاص ضابطہ کے تحت لانا انسان کے لئے ناممکن ہے جب کہ وہ اللہ کے مقررہ ضابطہ ہی کے تحت ہیں ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی جزا و سزا کا ذکر انسان و سماج کے لئے زیادہ مفید و مؤثر ہو سکتا ہے۔ خواہ اچھے کاموں پر رغبت دلانے کے لئے ہو یا برے کاموں سے بچانے کے لئے ہو۔

آخرت دنیا سے دور بھی نہیں ہے یوں سمجھئے کہ زندگی کے دو حصے ہیں ایک دنیا اور دوسرا آخرت درمیان میں موت گویا تھکاوٹ دور کرنے کے لئے ایک وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر۔

زندگی کے اس دوسرے حصہ کا ذکر و تذکرہ آج سے نہیں اسی وقت سے شروع ہوا ہے جب سے انسان نے زمین پر قدم رکھا ہے۔ یہ ذکر و تذکرہ اللہ کی ہدایت نے

شروع کیا اور مسلسل جاری رہا اور حیرت ہے کہ اب تک کسی نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف کا ثبوت نہیں پیش کیا، بلکہ انکار کی صورت میں جو زندگی میں خلاء رہ جاتا ہے اس کو پُر کرنے کی کوشش بھی نہ ہو سکی اور اچھے و برے کاموں کی جزاء و سزا کے بارے میں جو طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب بھی اب تک نہ فراہم کیا جا سکا۔ حقیقت ہمیشہ حقیقت رہی اس کی سچائی کے لئے بس اتنی بات کافی ہے کہ وہ سچ ہے بچہ کی سمجھ میں اگرچہ نہیں آتا کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جل جائے گا، دودھ کے استعمال سے قوت آئے گی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آنے سے نہ آگ کی خاصیت (جلانا) بدلتی ہے نہ دودھ کی خاصیت (قوت پہنچانا) میں تبدیلی آتی ہے اور نہ بچہ کے سرپرست آگ سے ڈرانے اور دودھ سے رغبت دلانے میں کوئی کمی کرتے ہیں۔

بلاشبہ جدید دنیا کے انسان نے علم و عقل کے ذریعہ بہت سی حقیقتوں کو دیکھ لیا ہے، لیکن کوشش و جدوجہد کے باوجود کتنی بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جن تک اس کی نظر نہیں پہنچ سکی ہے، جن حقیقتوں کو اس نے علم و عقل کے ذریعہ دیکھا ہے ان کا وہ اس سے پہلے انکار کرتا رہا ہے۔ لیکن دیکھنے کے بعد نہ صرف اقرار کرنے پر مجبور ہوا بلکہ انکار کرنے والوں کو ویسے ہی نادان وجاہل سمجھتا ہے۔ جیسے بچہ کو اس کا سرپرست نادان وجاہل سمجھتا ہے۔

پھر حقیقتوں کو دیکھنے کے لئے جدید دنیا کے انسان نے علم و عقل کا جو آئینہ تیار کیا ہے اس کا تعلق زندگی کے پہلے حصے (دنیا) سے ہے، زندگی کے دوسرے حصہ (آخرت) کو دیکھنے کے لئے نہ اس نے آئینہ تیار کیا نہ کسی اور طرح دیکھنے کا دعویٰ کیا بس بلا دلیل انکار کر دینے ہی کو غنیمت جانا ——————— بہت ممکن ہے یہ صورت حال اس بناء پر ہو کہ اس نے جو آئینہ تیار کیا ہے اس میں زندگی کا دوسرا حصہ (آخرت) اپنی وسعت کی وجہ سے نہ سما سکتا ہو اور اس کے لئے جس آئینہ کی ضرورت ہو اس کی تیاری پر وہ قدرت نہ رکھتا ہو۔ اس کمزوری کو چھپانے کے لئے اس نے انکار کی راہ اختیار کی ہو۔

لیکن جس انداز سے زندگی کی حقیقتوں کی دریافت ہو رہی ہے اس سے بعید نہیں کہ اس بڑی حقیقت کی دریافت کے لئے بھی راہ ہموار ہو جائے اور ہدایت الٰہی سے

مدد لینے پر مجبور ہونا پڑے۔ انسان اور سماج پر کنٹرول کی ضرورت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے لئے ساری تدبیریں فیل ہو رہی ہیں۔ اب تو جا رونا چار نار جہنم سے خوف دلانے کا ذکر بھی زبان پر آنے لگا ہے کیا عجب ہے کہ یہی ضرورت آخرت کی جزا اور سزا پر ایمان کا دروازہ کھول دے اور زندگی کا دوسرا حصہ بھی نظر آنے لگے۔

قرآن میں آخرت کی جزا و سزا کا ذکر جنت و جہنم سے کیا گیا ہے۔ جنت میں اعلیٰ درجہ کی راحت و منفعت اور جہنم میں سخت قسم کی اذیت و مضرت بتانا مقصود ہے۔ جب موقع کسی بات کے کرنے نہ کرنے کا ہو یا کسی حکم کے ماننے نہ ماننے کا ہو یعنی کرنے کا حکم دیا جائے اور نہ کرنے کی تاکید کی جائے ایسے موقع پر راحت و اذیت یا منفعت و مضرت کا ذکر لازمی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی شخص کوئی بات سننے سمجھنے کے لئے تیار نہ ہو۔ جنت و جہنم میں جن چیزوں کا ذکر ہے یہ بالعموم وہی ہیں جو انسان کی بول چال میں آتی ہیں۔ اگر ان کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر ہوتا جو انسان کی بول چال میں نہیں آتی ہیں تو لوگوں کا سمجھنا دشوار ہوتا، پھر جنت کی امید دلانے اور جہنم سے خوف دلانے کا مقصد فوت ہو جاتا، جو لوگ جنت و جہنم کے چیزوں کے بکثرت ذکر مذکورہ پر اعتراض کرتے ہیں، وہ نہ لوگوں کی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ان کی اصلاح کے طریقوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ (جاری ہے)

بعثت انبیاء و رسل کا اساسی مقصد
بعثت محمدی کی امتیازی و تکمیلی شان —— نیز
انقلاب نبوی کا اساسی منہاج ——
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرم کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ... روپے

اسلام اور عورت کا مقام
ڈاکٹر اسرار احمد
کا مدلل و مفصل خطاب
عورت اقبال کے کلام میں

مرکزی انجمن خدام القرآن ٣٦۔ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ:

کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیِّ اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے ایک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از :- ڈاکٹر اسرار احمد

(گذشتہ سے پیوستہ)

ترتیب و تسوید : جمیل الرحمٰن / عاکف سعید

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصاً علٰی افضلھم وخاتم النبیین سید المرسلین محمد ن الامین وعلٰی آلہ وصحبہ و ذریتہ اجمعین ـــــ امابعد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ـ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّھُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ کَفَّرَ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَاَصْلَحَ بَالَھُمْ ۝

صدق اللہ العظیم

وصلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

حضرات! یاد ہوگا کہ پچھلے جمعہ کو ہم نے اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ کا آغاز کیا تھا۔ لیکن اس سورہ کا درس باقاعدہ شروع نہیں ہوسکا تھا بلکہ میں نے ترتیبِ مصحف

کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں آپ حضرات کے گوش گزار کی تھیں۔ ان میں سے بھی دو باتیں رہ گئی تھیں جو گویا مجھ پر ایک قرض ہے جسے میں عجلت کے ساتھ ادا کرکے اِس سورۂ مبارکہ کے درس کا باقاعدہ آغاز کروں گا۔ ان شآء اللہ العزیز۔

رکوعوں کی تقسیم

ایک بات جو بیان کرنے سے رہ گئی تھی وہ بڑی سورتوں کی تقسیم سے متعلق ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ سورۂ بقرہ چالیس رکوعوں میں تقسیم ہے۔ جبکہ یہ سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو ہم پڑھنے والے ہیں اس کے چار رکوع ہیں ۔۔۔ تو درحقیقت رکوعوں کی یہ تقسیم بھی دورِ نبوی یا دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی۔ یہ تقسیم بھی بعد میں کی گئی ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ طویل سورتوں کا کوئی حصہ ایک شخص نماز میں پڑھنا چاہے تو معیّن ہونا چاہیے کہ ایک رکعت میں کتنا حصہ وہ پڑھے کہ بے ربطی بھی پیدا نہ ہو اور مضمون درمیان سے کٹے بھی نہیں۔ بلکہ اس تقسیم میں ایک حسنِ معنوی برقرار رہے۔ اس کا مجھے اعتراف ہے کہ جس شخص یا جن اشخاص نے بھی یہ تقسیم کی ہے انہوں نے بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔ اکثر جگہوں پر جو رکوعوں کی تقسیم ہے، وہ تقسیم مضامین کے اعتبار سے درست ہے۔ کہیں کہیں اختلاف کی گنجائش محسوس ہوتی ہے جو میں مختلف مواقع پر اپنے درس کے دوران عرض کرتا رہا ہوں لیکن وہ شاذ کے درجہ میں ہے۔ اکثر و بیشتر تقسیم صحیح ہے ۔۔۔ یہ لفظ رکوع رکعت ہی سے بنا ہے ۔۔۔ آپ جب قیام میں تلاوت کے بعد رکوع کرنا چاہیں تو آسانی کے لیے وہاں رکوع کا نشان لگا دیا گیا ہے ۔۔۔ قرآن مجید کی پینتیس (۳۵) سورتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک رکوع پر ہی مشتمل ہیں۔ چھوٹی سورتیں ہیں لہٰذا ان کو ایک رکعت میں پڑھا جاسکتا ہے اور پڑھا جانا چاہیے۔ یہ تو ہماری تن آسانی کا معاملہ ہے کہ ہم اس کو بھی تقسیم کر دیتے ہیں۔ میں آج درس کے لیے آتے ہوئے گن رہا تھا تو اندازہ ہوا کہ بائیس سورتیں وہ ہیں جو دو دو رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ پھر تین تین اور چار چار یا ان سے بھی زائد رکوعوں پر مشتمل سورتیں ہیں۔ سب سے زیادہ رکوع سورہ بقرہ کے ہیں جو قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ رکوعوں کی تقسیم بھی دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک میں جو مصحف طبع ہوتے ہیں ان میں بعض میں رکوعوں کی تقسیم

نہیں ہوتی اور رکوع کا نشان نہیں ہوتا۔

قرآن مجید کا اسلوب

پچھلی گفتگو میں جو دوسری بات رہ گئی تھی اس کا تعلق قرآن مجید کے اسلوب سے ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کا اسلوب (STYLE) کیا ہے! آج کل کا پڑھا لکھا شخص 'کتاب' کے نام سے جس اسلوب سے مانوس ہے، اس کا اپنا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ کتاب کا ایک عنوان ہوگا اور اس عنوان کی مناسبت کے ساتھ اس کے بہت سے ابواب — (CHAPTERS) ہوں گے جو بڑی ترتیب کے ساتھ کتاب کے عنوان یا موضوع کو آگے لے کر چلیں گے۔ ایک تمہید ہوگی، مقدمہ ہوگا۔ پھر اصل کتاب ابواب کی ترتیب کے ساتھ آگے چلے گی۔ ہر باب کا ذیلی عنوان ہوگا اس کے مطابق موضوع سے متعلق بحث کا ایک پہلو مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح ترتیب وار ابواب میں بحث آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ آخر میں بحث کو سمیٹ کر ایک نتیجہ مرتب کر دیا جائے گا۔ تو کتاب کے نام سے اس اسلوب سے ہم عام طور پر متعارف ہیں۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب نہیں ہے۔ آج کل کتاب کا ایک اور انداز بھی رائج ہے وہ ہے 'مجموعۂ مضامین' (COLLECTION OF ESSAYS) ایسی کتابوں میں ہر مضمون اپنے عنوان کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ ایسی کتابوں کو 'مجموعۂ مضامین' یا 'مجموعۂ مقالات' سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس انداز سے بھی ہم مانوس ہیں۔ لیکن قرآن مجید اس انداز کی بھی کتاب نہیں ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اپنا اسلوب اور اسٹائل کیا ہے! یہ ہے وہ بات جسے لوگ اکثر سمجھ نہیں پاتے۔ لہٰذا وہ قرآن مجید کے انداز اور اسلوب سے صحیح طور پر مانوس و متعارف نہیں ہو پاتے۔ پھر جو اصنافِ سخن قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہے، جیسے اشعار، غزل، قصیدہ، نظم، — تو قرآن نہ شعر ہے نہ قصیدہ ہے بلکہ شعر کی تو قرآن مجید میں عموماً مذمت کی گئی ہے۔ استثنائی حالات سے متعلق کہا گیا ہے کہ شعر کہنے والوں میں کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر کے بارے میں سورۃ الشعراء میں قرآن مجید کا جو VERDICT (فیصلہ) آیا ہے وہ یہ ہے کہ: وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝

یعنی ان میں مبالغہ آرائی ہوتی ہے۔ یہ شعراء ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں اور ان کے پیروکار بڑے بے عمل قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ لوگ، وہ بات کہتے ہیں جس پر خود عمل نہیں کرتے ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو سورۂ یٰسین میں صاف طور پر آیا ہے کہ : "مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ط" "ہم نے انہیں شعر سکھایا ہی نہیں اور نہ ہی وہ ان کے شایانِ شان ہے"۔ جب شعر کے بارے میں مجموعی بات وہ ہے جو سورۂ شعراء میں فرمائی گئی تو گویا کہ یہ بات از خود واضح ہے کہ شعر گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان، مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے بہت ہی فروتر شے ہے ۔ اس ضمن میں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اگرچہ حضورؐ کو اچھے اشعار پسند آتے تھے اور آپؐ ان کی تعریف بھی فرمایا کرتے تھے لیکن آپؐ کبھی خود کوئی شعر پڑھنا چاہتے بھی تھے تو اس میں کوئی نہ کوئی لفظ آگے پیچھے ہو جاتا تھا کہیں سکتہ پیدا ہو جاتا تھا اور اس طرح وہ شعر بحر اور وزن سے نکل جاتا تھا ۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شعر پڑھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے سُنا اور مسکرائے اور مسکراتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ "اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" "میں گواہی دیتا ہوں آپؐ اللہ کے رسول ہیں"۔ مطلب کیا تھا! کہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ آپؐ کو شعر سے مناسبت نہیں ہے ۔ اور اُسی کا ثبوت مل رہا ہے کہ آپ شعر پڑھ رہے ہیں لیکن اس میں کہیں سکتہ ہو گیا ہے کہیں الفاظ آگے پیچھے ہو گئے ہیں — تو قرآن شعر نہیں ہے یہ ثابت ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر یہ ہے کیا۔ یہ معروف معنوں میں کتاب بھی نہیں، یہ مقالہ بھی نہیں، ESSAY بھی نہیں! ان میں سے کوئی بھی اصطلاح (TERM) قرآن مجید پر منطبق نہیں ہوتی۔ یہ ہے قابلِ غور بات!

جدید اصنافِ سخن میں جہاں تک میں نے غور کیا تو میں جس نتیجہ پر پہنچا وہ میں اس سے قبل بھی کسی موقع پر بیان کر چکا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جدید اصنافِ سخن میں دو چیزیں وہ ہیں جو قرآن مجید کے کچھ قریب آتی ہے — ایک وہ جسے آزاد شاعری (BLANK VERSE) کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک RHYTHM ہوتا ہے۔ الفاظ کا زیر و بم ہوتا ہے، ایک تناسب اور دلکشی ہوتی ہے لیکن قافیہ، ردیف، بحر، وزن ان چیزوں کا کوئی خاص

خیال نہیں رکھا جاتا ۔ اس لیے کہ جہاں ان کی فکر ہو جائے، وہاں کھینچ تان ہوگی کوئی بھرتی کا لفظ لانا پڑے گا۔ کہیں ردیف اور قافیہ کی رعایت کے باعث بہتر لفظ چھوڑ کر کم تر لفظ پر قناعت کرنی پڑے گی ۔ لہٰذا اس میں تصنع آتا ہے ۔ لیکن آزاد شاعری میں اس تصنع کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ بلکہ ایک مضمون ہے جو چل رہا ہے اس میں کچھ RHYTHM ضرور ہے لیکن بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کا کوئی سوال نہیں ـــــ تو یہ چیز قرآن مجید کے اسلوب سے کچھ قریب آتی ہے ۔

دوسری چیز جو اسلوب قرآنی کے کچھ قریب آتی ہے، وہ "انشائیہ" ہے کہ ایک شخص اس کے بجائے کہ وہ کوئی عنوان و موضوع سامنے رکھ کر کوئی مقالہ یا مضمون لکھ رہا ہو بلکہ اس کے ذہن پر کسی خیال کا ورود ہوا ہے اور وہ اُسے اٹھا رہا ہے ۔ انشائیہ کے معنی اٹھانے کے ہیں ـــ تو وہ اس خیال کو اٹھا رہا اور بیان کر رہا ہے یا لکھ رہا ہے تو یہ "انشائیہ" کہلاتا ہے اور جدید اصنافِ سخن کا یہ اسلوب بھی قرآن کے اسٹائل کے کچھ قریب آتا ہے ۔

لیکن اصل میں قرآن مجید کا جو اسلوب اور اسائل ہے وہ خطبات کا ہے اس کو میں یوں کہا کرتا ہوں کہ قرآن "COLLECTION OF DIVINE ORATIONS" ہے ۔ بالفاظِ دیگر یہ خطباتِ الٰہیہ کا مجموعہ ہے ۔ مختلف اوقات اور مختلف مواقع پر جو خدائی خطبات جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے ـــ اور اس وقت جو حالات تھے، جو کیفیات تھیں، ان پر تبصرے ہیں، جو ان خطبات کی شکل میں کیے گئے ۔ اس وقت جو مسائل اٹھے ہوئے ہیں، ان کا ان میں حل ہے ۔ اس وقت جو اعتراضات اور اشکالات پیش کیے گئے، ان کے جوابات دیئے گئے ہیں ۔ اس وقت اگر ضرورت مقتضی تھی کہ حلال و حرام کے احکام واضح کیے جائیں تو وہ احکام بیان کر دیئے گئے ۔ گویا کہ جس طرح ایک خطیب خطبہ دیتا ہے اور اس وقت کے جو مسائل ہیں، ان پر اظہار رائے کرتا ہے ۔ کبھی وہ ایک بات کہتا ہے اور اس کو ادھورا چھوڑ کر دوسری بات شروع کر دیتا ہے ۔ پھر پہلی بات کی طرف آتا ہے ۔ خطیب کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک لائن پر چلے، اس کے خطبہ میں منطقی ربط ہو وہ کبھی ایک موضوع کو طوالت دے کر پھر یہ کہہ کر کہ میں اپنے اصل موضوع کی طرف

واپس آتا ہوں ؛ اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹتا ہے ۔۔۔ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے یہ تو ملے گا کہ کبھی کسی درمیانی موضوع پر بات طویل ہوگئی ، پھر اصل موضوع زیر گفتگو آگیا۔ لیکن آپ کو یہ الفاظ نہیں ملیں گے کہ اب آیئے اصل موضوع کی طرف ۔۔۔ یہ بات قرآن مجید پر غور و تدبّر کرنے والے کو تلاش کرنی ہوگی۔ اسی طرح خطیب کبھی سامعین کو حاضر کے صیغہ میں مخاطب کرتا ہے، کبھی ان کو غائب کے صیغہ میں ۔۔۔ یا غیر موجود افراد کو حاضر گردان کر حاضر کے صیغہ میں اُن سے براہِ راست خطاب کا انداز اختیار کرتا ہے ۔۔۔ تو ہمارے ادب اور سخن کی جو معروف اصناف ہیں، ان میں سے "خطبہ" وہ ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کا اسلوب اور اسٹائل خطبات جیسا ہے ۔۔۔ پس یہ دو باتیں تھیں جو مجھے عرض کرنی تھیں چونکہ گذشتہ گفتگو میں یہ رہ گئی تھیں ۔۔۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر درس شروع کرتے ہیں ۔ پہلے چند باتیں خاص اس سورت سے متعلق ذہن نشین فرما لیجئے۔

اِس سورۂ مبارکہ کے نام

اس سورۂ مبارکہ کے متعلق یہ بات تو میں نے آپ کو پچھلی نشست میں بتا دی تھی کہ اس کے دو نام ہیں۔ ایک تو وہی مشہور نام یعنی محمدؐ ۔۔۔ چونکہ دوسری آیت ہی میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ گرامی آیا ہے تو اس اعتبار سے اس سورہ کو آپؐ ہی کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا نام ہے "سورۃ القتال" اور اس کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ اس سورۃ مبارکہ کی آیت نمبر ۲۰ میں لفظ قتال آیا ہے اور قتال اس سورۂ مبارکہ کا ایک مرکزی مضمون بھی ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ میں جو موضوعات زیرِ گفتگو آئے ہیں، ان میں اہم ترین موضوع کی مناسبت سے اسے "سورۃ القتال" بھی کہا گیا۔

اِس سورت کا اسلوب

دوسری بات اس سورہ کے متعلق جاننے کی یہ ہے کہ اس کا اسلوب (STYLE) مدنی سورتوں سے منفرد ہے۔ یہ اسٹائل آپ کو مدنیات میں کہیں اور نہیں ملے گا۔ یہ بات تو آپکو اکثر مدنی سورتوں میں مل جائے گی کہ بلاتمہید براہِ راست بات شروع ہو جاتی ہے۔ پھر جو مدنی سورتیں حروفِ مقطعات سے شروع ہوئی ہیں وہ صرف دو ہیں ایک "بقرہ" اور دوسری "آلِ عمران" ۔۔۔ دونوں کا الٓمّٓ سے آغاز ہوا ہے جبکہ مکیات میں ستائیس

سورتیں وہ ہیں جو حروفِ مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ پھر آگے چل کر چھٹے گروپ کی جو مدنیات آئیں گی ان میں پانچ سورتوں کو ہم مسبحات کہتے ہیں۔ ان کا آغاز بڑے پُرجلال اسلوب سے ہوتا ہے جیسے سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اور يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۔ ورنہ اکثر و بیشتر مدنی سورتیں وہ ہیں جن میں حروفِ مقطعات بھی نہیں ہیں اور جن میں تمہید بھی نہیں ہے بلکہ براہِ راست گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ہم سورہ الطلاق اور سورۃ التحریم میں دیکھتے ہیں کہ براہِ راست نبی اکرم ﷺ سے خطاب فرما کر بات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ سورۂ نساء شروع ہو جاتی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ الخ کے الفاظ سے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ شروع ہوتی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کے الفاظ سے۔ اس ضمن میں مزید سورتوں کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس اغلباً سے جو اکثر مدنی سورتوں کا اسلوب ہے وہ ہی اس زیرِ درس سورت کا بھی ہے۔ البتہ اس میں ایک یہ خاص بات آپ دیکھیں گے کہ اس سورت کی اڑتیس آیات میں ان میں سے دو کے سوا بقیہ چھتیس آیات 'هم' یا 'كم' پر ختم ہوتی ہیں۔ مثلاً اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ گویا ہم جن کو قوافی کہتے ہیں وہ ۳۶ آیات میں آپ کو ملیں گے۔ دوسری خاص بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات پر ختم ہونے والی کوئی بھی آیت اس سورت میں موجود نہیں ہے جبکہ قرآن مجید کا عام اسلوب یہ ہے کہ اکثر و بیشتر آیات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات پر ختم ہوتی ہیں۔ جیسے ان اللہ غفورٌ رحیمٌ۔ ان اللہ عزیز حکیم۔ کان اللہ غفوراً رحیماً۔ تو یہ انداز آپ کو اس سورتِ مبارکہ میں بالکل نہیں ملے گا۔ مدنی سورتوں میں اس انداز کی یہ سورت اپنی جگہ بالکل منفرد ہے۔

اِس سورہ کا زمانۂ نزول

تیسری بات جو اس سورت کے سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے، وہ اس کا زمانۂ نزول ہے۔ اگر اس کا تعین نہ ہو تو اس سورت کے بعض مضامین کو سمجھنے میں آدمی کو شدید دقت

پیش آتی ہے۔ میں نے جو تحقیق کی تو یہ بات میرے سامنے آئی کہ ہمارے بعض مفسرین نے تو اس مسئلہ کو چھیڑا ہی نہیں۔ بعض نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اس کے زمانۂ نزول کو معین کیا ہے۔ ان میں سے مجھے ان مفسرین کی رائے سے اتفاق ہے جنہوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ غزوۂ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے۔ یہ بات تو میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً پہلے تک قرآن مجید کی جو آیات نازل ہوئی ہیں، وہ اکثر و بیشتر سورۂ بقرہ میں جمع ہیں۔ سولہ سترہ ماہ تک جو خطباتِ الٰہیہ وقتاً فوقتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوتے رہے ان کے متعلق آپؐ ہدایات جاری فرماتے گئے کہ ان آیات کو فلاں جگہ رکھو یا اس آیت کو فلاں آیت کے بعد یا پہلے رکھو وغیرہ۔ درحقیقت ایسی تمام آیات نے سورۂ بقرہ کی شکل اختیار کی۔ میرے علم کی حد تک اس میں دو مقامات ایسے ہیں جو اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ممکن ہے اور بھی ہوں۔ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کے متعلق ہمیں روایت ملتی ہے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں عطا ہوئی ہیں۔ اور یہ عرش تلے کے خاص خزانوں میں سے وہ قیمتی موتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے تحفے کے طور پر حضورؐ کو عطا فرمائیں۔ اسی طرح سود کی حرمت والی جو آیت ہے اور یہ جس رکوع میں آئی ہے اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام آیات قریباً ۹ھ میں جا کر نازل ہوئی ہیں

قرآن مجید میں اکثر سورتیں ایسی بھی ہیں، جو بیک وقت نازل ہوئیں لہٰذا ایسی سورتیں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل خطبہ ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ تو بہت طویل سورت ہے — ڈھائی پاروں کے لگ بھگ پھیلی ہوئی ہے اور اس میں ۲۸۶ آیات ہیں تو درحقیقت یہ مجموعہ خطباتِ الٰہیہ ہے۔ البتہ سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ بھی غزوۂ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے لیکن یہ یقیناً بیک وقت نازل ہوئی ہے اور یہ بھی ایک مکمل خطبہ ہے۔ اس کا اسلوب (STYLE) بتا رہا ہے کہ یہ مختلف اوقات میں نازل ہونے والی سورت ہے ہی نہیں — اس میں قوافی کا

جو اہتمام ہے، اس کا مضمون جس طرح سے مربوط ہے، وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ایک ہی خطبہ ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہے اور اس موتی کو مصحف میں اس مقام پر جڑ دیا گیا ہے۔

اِس مقام پر لانے کی حکمت

یہ سورت اس مقام پر کیوں رکھی گئی۔

اس کے متعلق میں پچھلی نشست میں عرض کر چکا ہوں اسی کا اعادہ کر رہا ہوں کہ جس طریقہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے گروپ کی جو دو مدنی سورتیں ہیں یعنی سورۂ انفال اور سورہ توبہ — تو جو ربط و تعلق ان میں ہے، بعینہٖ وہی ربط و تعلق سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سورہ فتح میں ہے — سورہ انفال اور سورہ توبہ سے پہلے دو مکی سورتیں ہیں۔ سورہ انعام اور سورہ اعراف جن میں قریش پر اتمام حجت ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد چونکہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ جو چند لوگ ایمان لائے وہ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ معدودے چند لوگ ایسے بھی تھے، کہ ایمان تو لا چکے تھے مگر وہ ہجرت نہ کر سکے۔ لیکن اس وقت مکہ کی عظیم ترین اکثریت ان قریشیوں پر مشتمل تھی جو ایمان نہیں لائے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو دائمی سنت ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیج دیا جائے؛ وہ قوم اگر انکار کرے گی تو اس پر عذابِ خداوندی آکر رہتا ہے۔ اس لیے کہ اس قوم پر آخری درجہ میں اتمامِ حجت ہو جاتا ہے کہ ان ہی میں ایک فرد، ان ہی کی زبان بولنے والا، ان ہی میں بود و باش رکھنے والا، ایک شخص جس کی پوری زندگی اس قوم کے سامنے ہے، جس کے بے داغ کردار اور اخلاقِ حسنہ کا مشاہدہ اس قوم نے کیا ہے، وہ اگر انہیں اللہ کی طرف دعوت دے اور اس کی دعوت کو بھی وہ قوم رد کر دے تو ایسی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں پھر رعایت نہیں ہوتی۔ پھر اس قوم کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ ہلاک کرنے کے مختلف انداز رہے ہیں۔ کبھی سیلاب آگیا جیسے حضرت نوحؑ کی قوم کو ہلاک کیا گیا۔ کبھی قوم کے سر برآوردہ لوگوں کو باہر نکال کر سمندر میں ڈبو دیا گیا جیسے فرعون اور اس کے لشکر کے ساتھ معاملہ ہوا۔ کچھ بستیوں کو الٹ دیا گیا۔ کچھ بستیوں پر تیز آندھی بھیج دی گئی۔ جس میں پتھر تھے۔ کہیں زلزلہ آگیا۔ تو یہ

مختلف طریقے ہیں جن سے قوم لوط ، قوم لوط ، قوم ہود ، قوم صالح ، قوم شعیب، آلِ فرعون نیست و نابود کی گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے چنانچہ مکی دور کے آخر میں سورہ انعام اور سورہ اعراف کے نزول کی شکل میں گویا بنو اسماعیل پر اتمام حجت ہوگیا۔ یہی وجہ ہے ہجرت کے دو ہی سال بعد غزوۂ بدر کی شکل میں قریش کے ان لوگوں پر اللہ کا عذاب آیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے سخت ترین مخالف تھے۔ اور قریش مکہ پر اللہ کے عذاب کی یہ پہلی قسط قریش ہی میں سے اُن لوگوں کے ہاتھوں آئی جو ایمان لے آئے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کر کے اب مدینہ میں مقیم تھے۔ چنانچہ مہاجرین کے ہاتھوں میدانِ بدر میں ان منکرین قریش میں سے ستر سرکردہ افراد کی گردنیں کٹوائی گئیں۔ عذاب کی یہ خاص صورت تھی جو اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے لیے طے فرمائی تھی ــــ یہ گویا مشرکینِ مکہ پر عذابِ الٰہی کی پہلی قسط تھی جس کا ذکر ہے سورہ انفال میں ــــ اور اس عذاب کا نقطۂ عروج وہ ہے جس کا ذکر ہے سورہ توبہ میں کہ حج کے موقع پر اعلان عام کر دیا گیا کہ مشرکین کے لئے چار مہینوں کی مہلت ہے جس کے بعد ان کا قتلِ عام ہوگا اگر وہ ایمان نہیں لائے۔

حاصلِ کلام یہ کہ سورہ انفال جس میں مشرکینِ مکہ پر عذابِ الٰہی کی پہلی قسط کا ذکر ہے اور سورہ توبہ جس میں اس عذاب کے نقطۂ کمال کا ذکر ہے، دونوں کو جوڑ کر مصحف میں اُن دو مکی سورتوں کے بعد رکھ دیا گیا جن میں مشرکینِ مکہ پر اتمامِ حجت کر دیا گیا تھا یعنی سورۃ انعام اور سورۃ اعراف۔ بالکل یہی ربط و تعلق سورۂ محمدؐ اور سورۂ فتح میں نظر آتا ہے۔ سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نازل ہوئی ہے غزوۂ بدر سے متصلاً قبل ــــ گویا مشرکینِ مکہ پر عذابِ خداوندی کی پہلی قسط کی تمہید اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئی ہے۔ جبکہ اُس عذابِ الٰہی کی آخری قسط یعنی فتح مکہ کی تمہید ہے صلح حدیبیہ۔ چنانچہ اس کا ذکر سورہ فتح میں آرہا ہے جس کا آغاز ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ سے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ط ــــ لہٰذا سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سورہ فتح کو مصحف میں اس مقام پر یک جا کر دیا گیا ــــ باقی اس گروپ کی جو تیسری مدنی سورت ہے یعنی سورۃ الحجرات، وہ ہمارے منتخب نصاب میں بھی شامل ہے۔ اس کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کی حیثیت سورہ فتح کی آخری دو آیات کی شرح اور توضیح

تفصیل کی ہے اور اس اعتبار سے وہ گویا سورہ فتح کے ایک ضمیمہ اور تتمے کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یوں کہ سورہ فتح کی آخری آیت ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ..... الخ دراصل سورہ حجرات کے اکثر و بیشتر حصّہ کی شرح پر مشتمل ہے۔ اسی طرح سورہ حجرات کے آخری حصّہ میں جہاد کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق درحقیقت سورہ فتح کی آخری آیت سے ماقبل آیت سے ہے: هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؕ — پس میرے نزدیک سورۂ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے متعلق یہ رائے درست ہے کہ یہ غزوۂ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے۔

ایک اہم نکتہ

یہ نکتہ پیشِ نظر رکھیے کہ مکّہ کے جو بارہ ساڑھے بارہ برس ہیں ان میں مسلمانوں کو ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ جس کا میں نے "PASSIVE RESISTANCE" کے نام سے آپ حضرات کے سامنے بارہا ذکر کیا ہے، کہ ماریں کھاؤ لیکن ہاتھ نہ اٹھاؤ — اس کے بعد سورہ حج کی آیات ۳۹ تا ۴۱ نازل ہوئیں جن میں یہ آیت بھی ہے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ یعنی اجازت دی جارہی ہے ان لوگوں کو جن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے جن پر جنگ ٹھونسی گئی ہے لیکن اب تک ان کو ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی، اب ان کے ہاتھ بھی کھول دیئے گئے — اجازت کے ساتھ ہی نصرت کا وعدہ بھی فرمالیا چنانچہ آیت کے اختتام پر فرمایا: وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ "اور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے"۔ — سورہ حج کی آیات ۳۹ تا ۴۱ کے متعلق ایک عرصے سے میرا گمان یہ تھا کہ یہ دورانِ سفرِ ہجرت میں نازل ہوئی ہیں۔ الحمدللہ مجھے حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ایک روایت بھی مل گئی کہ ان رضؓ کی رائے بھی یہی ہے کہ سورہ حج کی یہ آیات نہ مکّی ہیں نہ مدنی بلکہ درحقیقت اثنائے سفرِ ہجرت میں نازل ہوئی ہیں — بہرحال ان آیات میں جو بات فرمائی گئی اُس کو ہم اذنِ قتال کہیں گے۔ ابھی حکمِ قتال نہیں آیا — چنانچہ ہجرت کے فوراً بعد سورہ بقرہ جو پہلی مدنی سورت ہے، اس میں قتال کی فرضیت کا حکم آگیا: كُتِبَ

عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ ـــ اور بار بار اس حکم کو مختلف اسالیب سے دہرایا گیا۔ آیت ۱۹۰ میں فرمایا: وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ ۔ پھر آیت ۱۹۳ میں فرمایا: وَقَاتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ لِلّٰہِ ؕ ـــ "اور ان مشرکین سے جنگ جاری رکھو حتیٰ کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے اور دین یعنی نظامِ اطاعت اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے"۔

حکمِ قتال تو آگیا لیکن فی الواقع قتال کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی تمہید کے طور پر سورہ بقرہ میں حضرت طالوت اور جالوت کے قتال کا ذکر کر دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت مارا گیا اور اُن کی شخصیت اُبھر کر سامنے آئی جو ایک نوخیز چرواہے تھے۔ بعد میں وہ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ اور بنی اسرائیل کی بادشاہت بھی ان کے حصے میں آئی ـــ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اُمت کے اس واقعہ کے حوالہ سے گویا حضورؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کو پیشگی بتا دیا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے اور حضرت طالوت کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے اس قول کے ذریعہ جو جالوت کے لشکر کے مقابلہ میں بہت تھوڑے تھے، اپنی یہ سنّت بھی بطورِ بشارت بیان فرما دی: قَالَ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰہِ ۙ کَمۡ مِّنۡ فِئَۃٍ قَلِیۡلَۃٍ غَلَبَتۡ فِئَۃً کَثِیۡرَۃًۢ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ۝ "جو لوگ جالوت کے لشکر جرار کو دیکھ کر ہراساں ہو رہے تھے، اور کم ہمتی دکھا رہے تھے، ان سے" ان لوگوں نے کہا جن کو یقین تھا کہ انہیں اللہ سے آخرت میں ملنا ہے کہ بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" گویا بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کے بالکل متوازی اُمتِ محمدؐ میں جو اہم واقعہ یعنی غزوۂ بدر ہونے والا تھا، اس کے ضمن میں بغیر اس کا پیشگی ذکر کیے حضرت طالوت و جالوت کے اس مقابلہ کے حوالہ سے اہلِ ایمان کو بتا دیا گیا کہ اگر تم نے صبر کا دامن تھامے رکھا اور اللہ کی راہ میں سرفروشی دکھائی تو اللہ تعالیٰ تمہاری قلیل تعداد کے باوصف نہیں کفار اور دشمنوں کے لشکرِ جرار پر غلبہ عطا فرمائے گا۔

تمہیدی گفتگو اور چند باتوں کی تشریح میں اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ ان شاء اللہ

قرآن فہمی اور خاص طور پر زیرِ مطالعہ سورت کو سمجھنے میں یہ باتیں مفید و نافع ہوں گی۔
اب آیئے ہم اس سورہ مبارکہ کے مطالعہ کا آغاز کرتے ہیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ ۝

پہلی آیت کی تشریح و توضیح

اس پہلی آیت کی رواں ترجمانی یہ ہوگی کہ "جن لوگوں نے اُس تعلیم و ہدایت کو جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی تھی، خود بھی ماننے سے انکار کیا اور خود ہی نہیں رُکے بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کا راستہ قبول و اختیار کرنے سے روکا۔ اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا، گمراہ کر دیا، ضائع کر دیا"۔ اس آیت کی تفہیم کے لیے چند باتیں نوٹ کیجئے — پہلی یہ کہ اس سورۂ مبارکہ کا آغاز کسی تمہید کے بغیر ہُوا ہے — دوسری یہ کہ 'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' فرما کر مشرکینِ مکہ اور اہلِ کتاب میں سے منکرینِ حق دونوں کا احاطہ فرما لیا گیا — تیسری یہ کہ 'وَصَدُّوْا' کا لفظ استعمال فرمایا جو عربی زبان میں فعلِ لازم اور متعدّی، دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح اس لفظ نے دونوں مفاہیم کا احاطہ کر لیا کہ خود بھی اللہ کے راستہ پر آنے سے باز رہے اور دوسرے کو بھی اس کو قبول کرنے سے روکا — اس روکنے کی بے شمار صورتوں پر مشرکین اور اہلِ کتاب عمل پیرا تھے۔ داعیٔ اوّل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بالخصوص اور ایمان لانے والوں کو بالعموم تمسخر و استہزاء اور لعن طعن کا ہدف بنانا تھا جن پر قابو تھا ان کو زبردستی ایمان لانے سے روکنا، ایمان لانے والوں پر انتہائی تشدد اور ان پر مظالم کے ایسے پہاڑ ڈھانا کہ ان کا ایمان پر قائم رہنا دشوار ہوجائے اور دوسروں کے لیے اس ستم و تعدّی کو دیکھ کر ایمان لانا مشکل ہوجائے۔ ان کی ہمت جواب دے دے۔ یہ وہ حربے تھے جو مشرکین [illegible] استعمال کرتے تھے۔ اہلِ کتاب بالخصوص یہود کے ہتھکنڈے یہ تھے [illegible] علیہ وسلم اور حضورؐ پر ایمان والوں کے خلاف لوگوں کو ورغلائیں اور ایسے ایسے دسوسے اور شکوک لوگوں کے دلوں

میں ڈالیں کہ وہ دینِ حق سے بدگمان ہوجائیں۔

"**صَدّو ا" کا ایک اور ہمہ گیر مفہوم** : علاوہ ازیں ہر وہ شخص بھی اللہ کے راستہ سے روکنے والوں کے زمرے میں آئے گا جو خالص مادی اقدار کو سامنے رکھ کر اپنی اولاد کی پرورش کرتا اور ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں عملی ہی نہیں بلکہ فکری و اعتقادی اعتبار سے بھی ان کا اپنے دین سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ آئندہ نسل واقعی مسلم ومومن ہوگی! ـــ برا نہ مانیئے گا، اپنے معاشرے کا ذرا ٹھنڈے دل اور منصفانہ نظر سے جائزہ لیجئے ـــ کیا ایسا نہیں ہے کہ جس شخص کو بھی وسائل میسّر آگئے چاہے وہ حلال سے آئے ہوں یا حرام سے ۔ الّا ماشاءاللہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا ان کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ان کو بیرونی ممالک میں ایکسپورٹ کردیں۔ تاکہ وہ وہاں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کما کر ان کو بھیجیں اور اس طرح وہ اپنا معیارِ زندگی بلند سے بلند تر کرتے چلے جائیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ محض طلبِ زر کی خاطر اپنی اولاد کو بعض ایسے ممالک میں بھیجنے میں بھی ذرا باک محسوس نہیں کرتے جو اعتقادی تہذیبی، تمدنی اعتبارات سے خالص کافرانہ، ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطہ ہائے فکر ونظر کے گڑھ اور پرچارک ہیں ۔ جہاں کا نظام از سرتا پیر اللہ تعالیٰ کی بغاوت پر قائم ورائج ہے۔ اس نوع کے طرزِ عمل سے بچنے کے لیے سورہ التحریم میں اللہ تعالےٰ نے اہلِ ایمان کو خبردار کردیا ہے : يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (آیت ۶) "اے لوگو! جو ایمان رکھتے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے ۔ جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مامور ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور جو حکم بھی ان کو دیا جاتا ہے، اسے بجالاتے ہیں "۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ایک بندۂ مومن کی ذمہ داری صرف اپنی ذات کو عذاب سے بچانے کی کوشش تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنی حدِ استطاعت

تک اپنی اولاد کو ایسی تعلیم و تربیت دے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان بنیں اور وہ اپنی صلاحیتیں، اپنی توانائیاں، اپنا وقت اور اپنا مال اللہ کے دین کا بول بالا کرنے اور اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے بھی لگائیں۔ لیکن اگر ہم نے اپنی اور اپنی اولاد کی تمام ذہانتیں، تمام فطانتیں، تمام قوتِ کار اس حقیر دنیا کے لیے کھپا دیں تو گویا ہم بھی اپنی اولاد اور آئندہ نسل کے لیے سدِراہ بن گئے —— یہ تمام مفاہیم بھی درحقیقت وَصَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللهِ میں شامل ہیں —— اسی میں اس معاشرہ، نظامِ حیات اور نظامِ حکومت کو بھی شامل سمجھیے جو اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف اساسات پر قائم ہو چونکہ یہ معاشرہ بھی اپنے رسم و رواج اور اجتماعی نظام کے باعث دینِ حق کی حقیقی دعوت و تبلیغ، اس پر کامل طور پر عمل پیرا ہونے اور اس کی اقامت کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے باطل نظام کو جو لوگ تحفظ دینے والے ہیں وہ بھی اسی آیت کے ذیل میں آتے ہیں۔

آیت کا آخری حصہ: اب اس پہلی آیت کے آخری حصہ کی طرف آیئے۔ فرمایا: اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ "اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں اور اکارت کر دیا۔" اس آیت کو اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا کے اصول پر سورہ کہف کی دو آیات سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ	"(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے (اللہ نے فرمایا
بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝	ہے کہ) کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے
اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ	اعمال میں سب سے زیادہ خاسر،
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ	ناکام اور نامراد کون لوگ ہیں؟ یہ
يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ	وہ لوگ ہیں کہ دنیا کی زندگی میں
صُنْعًا ۝ (آیات ۱۰۳-۱۰۴)	جن کی ساری محنت، کوشش،

بھاگ دوڑ راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔"

کوئی محض دنیا کمانے کے لیے اہل و عیال اور والدین کو یہاں چھوڑ کر کہاں پہنچا ہوا ہے! بچے باپ کی محبت، شفقت اور تربیت سے محروم ہیں۔ بوڑھے

ماں باپ بلک بلک کر ان کا انتظار کر رہے ہیں اور اکثر ان کو آخری وقت دیکھنے کی حسرت لے کر دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ اکثر و بیشتر نے اس دنیا کی عارضی زندگی اور اس کی خوش حالی کو اپنا مطمحِ نظر اور مطلوب و مقصود بنا لیا ہے۔ حالانکہ آخرت کے اعتبار سے ان کی یہ ساری تگ و دو قطعی اکارت جائے گی ـــــ یہ تو ہوئی آیت کے اس حصہ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ کی سورہ کہف کی آیات کی روشنی میں تاویلِ عام ـــــ اس سورہ کے نزول کے تناظر کو سامنے رکھیں تو اس کی تاویلِ خاص یہ ہوگی کہ مشرکینِ مکہ اپنے زعم میں جو کام خیر کے کام سمجھ کر کر رہے تھے مثلاً خانہ کعبہ کی نگرانی، حج کے انتظامات، حاجیوں کی خدمت، مہمانوں کی ضیافت اور دوسرے وہ کام جن کا شمار مکارمِ اخلاق اور مذہبی خدمات میں ہوتا تھا ـــــ اور اہلِ کتاب کے علماء اس گھمنڈ میں تھے کہ ہمارے پاس تورات ہے، ہم صاحبِ کتاب اور صاحبِ شریعت ہیں۔ ہم نبیوں کی اولاد ہیں، ہم اپنی قوم کو اپنی شریعت پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہیں، ہم برّ اور خیر کے فلاں فلاں کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ ضلّ کو یہاں بابِ افعال سے لا کر اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا: اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ـــ ہم نے بھٹکا دیے اُن کے اعمال ـــ ان کی ساری سعی و محنت اکارت گئیں۔ یہ اس میں مگن رہے کہ ہم خیر کے بہت سے کام کر رہے ہیں۔ وہ اللہ کے دین کا راستہ روکنے کے لیے ریشہ دوانیاں، سازشیں اور کوششیں کرتے رہے اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوتا چلا گیا۔ یہ دینِ حق کے راستہ کے سنگ گراں بننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے اور جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپؐ کا پیغام جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ یہ دشمنی اور عداوت میں لگے رہے اور اللہ نے دوسرے قبیلوں سے اپنے رسولؐ کے حامی کھڑے کر دیئے ـــ مکہ سے تین سو میل کی دوری کے فاصلہ پر یثرب سے اوس و خزرج کے لوگ آ کر جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ حضورؐ کو یثرب تشریف لے چلنے کی دعوت دی اور آپؐ کے وہاں ورودِ مسعود کے نتیجے میں یثرب مدینۃ النبی بن گیا۔ اور مدینہ کے اہلِ ایمان "انصار" کے معزز لقب سے مشرف ہوئے۔ یہاں فارسی

کی یہ کہاوت بالکل درست آتی ہے کہ "تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ" — انسان اپنے طور پر خوب تدبیریں کرتا رہتا ہے اور تقدیر کھڑی مسکراتی رہتی ہے کہ یہ لوگ کس چکر میں ہیں! جبکہ ہوگا وہی جو مشیت الٰہی ہوگی — تو اللہ تعالیٰ نے اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ میں اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ ان مشرکین مکہ کی تمام تدبیریں جو وہ دارالندوہ میں بیٹھ کر دین اللہ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کر رہے تھے، وہ سب رائیگاں گئیں۔ وہ انہی کوششوں میں لگے رہے۔
کہ ع ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں —
وہ اسی فکر میں رہے کہ اگر یہ دعوتِ توحید لوگوں نے قبول کر لی تو ہمارے اقتدار کو زوال آجائے گا، ہمیں اس مشرکانہ اور استحصالی نظام کے باعث جو سیادت و قیادت اور جو مراعات حاصل ہیں، وہ سب ختم ہو جائیں گی تو اس کو بچاؤ — ع نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے — اپنی قوتوں کو مجتمع کرو اور اس دعوت و پیغام کا راستہ روکو۔ لیکن یہ ساری کوششیں، محنتیں، سازشیں، تدبیریں اکارت ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ضائع کر دیا، ان میں سے کوئی بھی اپنے ہدف تک نہ پہنچ سکی۔ ان سب کو اللہ نے بھٹکا کر رکھ دیا۔

یہ تشریح و توضیح ہوئی اس سورہ مبارکہ کی اس پہلی آیت کی :
اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ
جن لوگوں نے جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کیا، اور آپؐ پر جو کلامِ الٰہی نازل ہوا اس کا انکار کیا اور جنہوں نے اللہ کے راستے کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اللہ نے ان کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

قابلِ توجہ بات

اس موقع پر ایک ضروری بات نوٹ کیجیے کہ ابھی لوگوں کو وہ پانی پھرا ہوا نظر نہیں آرہا تھا — یہ ایک نوع کی پیشین گوئی ہے۔ اس لیے کہ ابھی تو کفر کا زور ٹوٹا نہیں — البتہ غزوہ بدر کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ لیکن قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کا جو

قطعی اور یقینی ہوتے ہیں، انہیں عام طور پر ماضی کے صیغہ میں [illegible]
چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ قیامت کے حالات، [illegible] قرآن مجید میں
حشر کے حالات اور حساب و کتاب کی [illegible] ہیں، ان کا قرآن مجید میں اکثر و
بیشتر ماضی کے صیغہ میں بیان ہوا ہے [illegible] جو کچھ ہو چکا، جو کچھ ہو رہا ہے
اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب بیک وقت اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے
ہے۔ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا ط "انہیں یہ
چیز بڑی دور نظر آ رہی ہے اور وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔"

(جاری ہے)

بقیہ: مغرب کا معاشرہ

تہذیب سے، معاشرتی اور فکری عناصر - رومۃ الکبریٰ سے سیاست و قانون و فوجی نظام، نسلی تفاخر - اطالیہ سے عدم رواداری و خون ریزی - اسلام سے عہد حاضر کے سارے علوم کی بنیاد - ان تمام عناصر مستعار کیا تھا۔ تکنیکی ترقی، سیاسی کامیابی اور عالمی استحصال نے مغرب کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام دیا جہاں پہنچ کر اس نے انسانیت کو اپنے سے حقیر اور کمتر تصور کیا - انسان کو غلام بنایا - اس کا قتل عام کیا، دوسرے کے اقتصادی ذرائع اپنے لئے وقف کئے اور ساری دنیا کا استحصال کر کے صرف مغرب کی تعمیر کی - اپنی قدروں کو ارفع و اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے دوسروں کی قدروں کی تذلیل کی۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپکی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں - ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مولانا آزاد بحیثیتِ مفسرِ قرآن

مولانا اخلاق حسین قاسمی

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ جس طرح ادب وسیاست کے امام اور جہادِ حریت کے سرفروش سپہ سالار تھے اسی طرح قرآن حکیم کے مفسر اور شارح کی حیثیت سے بھی علماء اسلام میں مولانا مرحوم امتیازی شان اور منفرد عظمت کے مالک تھے۔

امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بعد جس عظیم ہستی کو قدرت نے علوم قرآنی میں وسیع تبحر اور گہری بصیرت عطا فرمائی وہ ابوالکلام تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں کتاب آسمانی قرآن حکیم کے علوم کو رازِ سربستہ کی طرح ناقابلِ فہم خیال کیا جاتا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان نے کلام الٰہی سے مسلمانوں کا سیدھا تعلق قائم کرنے کے لئے قرآن کریم کے لفظی اور بامحاورہ ترجموں کی داغ بیل ڈالی۔

اور پھر مولانا آزاد وہ پہلے داعی اسلام ہیں جنہوں نے زندگی کے ہر معاملے میں براہِ راست قرآن کریم پر غور وفکر کرنے اور اس سرچشمۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل کرنے کے سلسلے کو عروج پر پہنچایا۔ مولانا آزاد کے شعلہ بار قلم نے عزم ویقین، زہد وعبادت، سیاست وحریت، اخلاق وانسانیت اور محبت اور رواداری، غرضیکہ ہر عنوان پر اردو ادب کے شہ پارے قوم کو دیئے ہیں۔ اور ہر عنوان پر مرحوم کا قلم آیاتِ قرآنی کے برمحل اور برجستہ استدلال سے قرآن کی روشنی بکھیرتا چلا گیا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد کی روح ہمیشہ قرآن میں غوطہ زن رہتی اور ان کی نظروں کے سامنے قرآنی معارف قطار در قطار کھڑے رہتے جس میں مولانا نے قرآن حکیم کی عربی مبین، کو اردو ئے مبین، کے قالب میں ڈھالا ہے

بلاشبہ قرآن کریم کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے خدا کا پیغام ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ قرآن حکیم کا لسانی اور ادبی اعجاز، اس کی فصاحت وبلاغت اور اس

کا مخصوص خطابی طرز بیان بھی ایسا ہے جس نے عرب کے سنگ دل انسانوں کے دل گھلا دیئے بعد اس کے ادب کی قوت تاثیر کا لوہا مخالف سے مخالف نے بھی مانا۔

اس لئے ضرورت تھی کہ مولانا آزاد جیسا اردو ادب کا شہنشاہ اپنے زرنگار قلم سے اردو ادب میں کتاب مبین کی ایسی ترجمانی کرے جو عقل و فکر کو متاثر کرتی ہوئی قلب و جگر میں اتر جائے۔

اگر اہل عرب قرآن عظیم کا جادو اثر کلام سن کر اپنے دل ہار بیٹھے تو بلاشبہ قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کو مولانا آزاد کی روح پرور زبان میں پڑھ کر ہماری روح وجد میں آجاتی ہے۔

مولانا آزاد اپنے دور کے بہت بڑے عقلیت پسند مفکر ہیں، مگر قرآن حکیم کی تفسیر و تشریح کے معاملہ میں کتاب الٰہی کا ادب و احترام مولانا کو سخت احتیاط پسند بنا دیتا ہے۔ اور وہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کے مسلک کی پیروی پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انبیاء کرام کا طریق استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیں پھر ان کی بحثوں میں مخاطب کو الجھائیں، وہ براہ راست تلقین و اذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں جسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے اور ہر دل قدرتی طور پر قبول کر لیتا ہے لیکن ہمارے مفسرین متکلمین کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل نہیں رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کر لیں"

آگے فرماتے ہیں:

"اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہئے چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموس اس پر چسپاں کر دیا جائے ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل دانش فروشوں کا طریقہ تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چسپاں کئے جائیں"

پھر فرماتے ہیں:

"ایک طرف تو صحابہ و سلف کی روایات سے تغافل ہوا دوسری طرف روایات تفسیر کے غیر محتاط جامعوں نے الگ آفت مچادی" الفاتحہ ص ۶۹

مولانا آزاد مطالب قرآن میں عقل و بصیرت سے کام لینے کے مخالف نہیں لیکن وہ تفسیر و تشریح میں سلف صالحین کی پیروی اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ سلف کی راہ سے ہٹ کر تفسیر بالرائے کا دروازہ کھل جاتا ہے اور پھر فتنہ پسند ذہن اپنے غلط نظریات کے لئے قرآن کریم میں کھینچا تانی شروع کر دیتا ہے۔

اسی افتراق پسند طبقہ کے لئے اقبال نے کہا ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

مولانا آزاد مقدمہ تفسیر میں فرماتے ہیں :

"یہ الیقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی اور سعادت کے لئے سرچشمہ حیات حقیقت قرانی کا انبعاث ہے۔"

مولانا کا یہ یقین کتاب الہٰی کی ہر آیت پاک کی تفسیر میں نمایاں طور پر اپنا کام کرتا نظر آتا ہے اور مولانا اپنے ہر جملہ سے ناظرین کے دل میں یہ بٹھانے چلے جاتے ہیں کہ کتاب الہٰی ایک زندہ اور ناطق قانون حیات ہے اور وہ ہر صاحب ایمان سے اپنی پیروی اور اطاعت کا طالب ہے

چند مثالیں ملاحظہ ہوں

الحمد للہ ـــــ یہ لکھتے ہیں :

پس الحمد للہ کے معنی یہ ہوئے کہ حمد و ثنا میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جاسکتا ہے وہ سب اللہ کے لئے ہے کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے سب اسی سے ہے اور اسی میں ہے اور اگر حسن موجود ہے تو نگاہ عشق کیوں نہ ہو اور اگر محمودیت جلوہ افروز ہے تو زبان حمد و ستائش کیوں خاموش رہے ؟

آئینہ ما روئے ترا عکس پذیر ست
گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العالمین ـــــ کی تفسیر کے یہ چند کیف انگیز جملے بھی سنیئے خدا کے رب العالمین ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے، اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سر و سامان بھی کردیا ہے اور اس طرح کہ ہر حالت کی رعایت ہے ... ہر ضرورت کا لحاظ ہے ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور کمی بیشی نسبط میں آچکی ہے اور فطرت سب کے لئے ہر حالت میں یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ رکھتی ہے

الرحمٰن الرحیم ـــــ کی تفسیر کے یہ چند جملے بھی ...

قرآن بار بار ہمیں سناتا ہے کہ خدا کی رحمت و بخشش کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں

یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لئے بخشش و رحمت کا غیر محدود جوش پیدا ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ ایسے خطاؤں کے لئے اس کی بخشائشوں کا انتظار کریں۔

مولانا آزاد کی تفسیر ایک خصوصیت یہ بھی رکھتی ہے کہ قرآن کریم کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ مختصر تشریحی نوٹ ناظر کے سامنے رہتے ہیں جو عام حواشی قرآن کی طرح نہ تو ناظر کو الجھاتے ہیں اور نہ اصل مقصد سے دور لے جاتے ہیں۔

مولانا نے ان تشریحی نوٹوں میں لغت، بلاغت، حکمت اور تاریخ کے موتی بکھیرے ہیں اور اختصار کے ساتھ جامعیت پر مولانا آزاد کی بے پناہ قدرت بیان پر دلالت کرتے ہیں۔ مولانا صبر و نماز پر لکھتے ہیں۔

صبر و نماز کی قوتوں سے مدد لو، صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات و مصائب جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا ہو جائے۔

نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کو تقویت ملتی رہے۔

جس جماعت میں یہ دونوں قوتیں پیدا ہو جائیں گی وہ کبھی ناکامیاب نہیں ہو سکتی (البقرہ صہ ۲۲۲)۔

ایک نوٹ میں وحدت انسانی کا پیغام دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ وہ کون سا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر از سر نو آباد ہو جائے۔

قرآن کہتا ہے، صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارے لئے خدا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا (صہ ۱۳۲)

(جاری کردہ : مولانا آزاد سٹڈی فورم دہلی)

برِّعظیم پاک و ہند میں بابِ تجدید کے فاتح

حضرت مجدّد الفِ ثانی رح

(آخری قسط)

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

نام ونسب آپ کا اسمِ گرامی شیخ احمد، والدِ محترم کا نام شیخ عبدالاحد ہے ۲۸ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امیرالمومنین سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مل جاتا ہے اور اس نسبتِ فاروقی پر خود حضرت کو بھی ناز تھا۔ چنانچہ ملا حسن کشمیری کے اس سوال کے جواب میں کہ فلاں صاحب اللہ میاں کو عالم الغیب کہنے سے منع کرتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے، جواباً ارشاد فرماتے ہیں:

نوشتہ بودند کہ شیخ عبدالکریم بن محمد [illegible] حق سبحانہ تعالیٰ را عالم الغیب [illegible]
مخدوما فقیر را تاب [illegible] این سخنان نیست

بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت [illegible] آید [illegible]

[illegible]

ایسے ہی ایک دوسرے [illegible]
خطبہ میں قصداً [illegible] خلفاء راشدین کو ترک کر [illegible]

" استفہام [illegible] حضرت [illegible]
[illegible] کلمہ [illegible]

[illegible]

[illegible] الدِ محترم [illegible] عالم [illegible]
شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ [illegible] سلسلہ چشتیہ [illegible]

مجاز بھی۔ ایسے ہی سلسلہ قادریہ میں صاحب اجازت تھے [illegible] رحمہ اللہ تعالیٰ

سلسلہ نسب کی طرح آپ کا سلسلہ بیعت [illegible] عجیب و غریب [illegible] رکھتا ہے۔ ۲۲ واسطوں سے آپ خلیفۃ الرسول امیر المومنین سیدنا صدیق [illegible] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سلسلہ نقشبندیہ میں مل جاتے ہیں [illegible] اس کے علاوہ دوسرے سلاسل میں بھی صاحب اجازت تھے۔ لیکن اس سلسلہ سے والہانہ تعلق تھا [illegible] اور اس کے آپ مجدد بھی ہیں۔ اس نسبت عالیہ پر بڑا ناز تھا۔ [illegible] سے

[illegible] ہی بہ ایں جملہ خاصان خویش [illegible] دلم [illegible] خودی کن [illegible]

وطن۔ ولادت اور بشارت

[illegible] آباؤ اجداد کا وطن مدینہ طیبہ [illegible] اللہ سفر اختیار کرنا کے بعد کابل [illegible] تھا۔ آپ کے ساتویں جد بزرگوار شیخ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خاص خصوصی مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری [illegible] آف [illegible] تشریف [illegible] پہلے اطراف سرہند [illegible] نامی مقام [illegible] اس [illegible] کے [illegible] شاہ تغلق کو امام رفیع الدین سے گہری محبت [illegible] سلطان نے شہر سرہند بسایا اور تعمیر قلعہ کے دست امام رفیع [illegible] حکم شیخ سنگ بنیاد رکھا، اور پھر شیخ کے حکم ہی سے پلیس [illegible] [illegible] کر سرہند تشریف لائے۔ حسب تصریحات امام ربانی رح سرہند [illegible] تھا، جبکہ اس وقت ایک قصبہ ہے۔

سرہند کہ اعظم بلاد اسلام است الخ

(مکتوبات [illegible])

اور مکتوب ۲۱ حصہ ششم دفتر دوم میں ہے کہ

بلدۂ سرہند بوبار [illegible] احباب [illegible]

آگے بہت تعریف فرمائی۔ الغرض اس مبارک [illegible] مسعود [illegible] [illegible] اکرم [illegible] بروز جمعہ نصف شب کے قریب ولادت ہوئی۔ [illegible] اپنی نورانی شعاعوں سے تمام جہان ارضی کو [illegible] بقعۂ نور بنائے ہوئے ہے۔ اس عالم میں شیخ عبدالاحد کے [illegible]

طریقت کے مہرِ تاباں کا طلوع ہوتا ہے۔ کتنی نیک فال ہے۔ والدِ مرحوم خواب دیکھ چکے ہیں کہ تمام جہان میں ظلمت و تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ سور، بندر اور ریچھ لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں، اچانک میرے سینہ سے نور نکلا جس میں سے ایک تخت ظاہر ہوا۔ اس تخت پر ایک صاحب تکیہ لگائے رونق افروز ہیں، اس کے سامنے تمام زنادقہ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جا رہا ہے اور کوئی شخص باواز بلند کہہ رہا ہے ــــ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا (القرآن) علی ہذا اس خواب کا تذکرہ حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ سے کیا، جن کے متعلق امام ربانی کا ارشاد ہے کہ سلسلہ قادریہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کے بعد ان کی نظیر کم ملتی ہے۔ انہوں نے فرمایا تمہارے یہاں ایک لڑکا ہوگا جس سے الحاد و بدعت کی ظلمت ختم ہوگی" لڑکا پیدا ہوا ... اور ... صحیح ... اور رکیوں نے ... ہے،

ما ... ذالك ... وما ... سال ...

... ...

تحصیلِ علم

... بچپن ... عمر پر قرآن ... حفظ کیا جس پر ... حضرت مجدد ... اکثر کتب ... تصوف ... والدِ بزرگوار ... دوسرے علماء سرہند سے پڑھیں۔ علاوہ ازیں مولانا کمال کشمیری سے فنون کی کتابیں شیخ یعقوب سے کتب احادیث ... قاضی بہلول بدخشانی رحمۃ اللہ سے متفرق کتب پڑھ کر تکمیلِ علم کی۔ شیخ کو ادب ... میں بے نظیر ملکہ حاصل تھا، جس پر آپ کی تصانیف دال ہیں۔ دربارِ اکبری کے ابوالفضل اور فیضی کسی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے لیکن شیخ کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء

تحصیلِ طریقت

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد تصوف کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ شعر خود خواجہ ... تصوف اور نسبت مع اللہ کو آپ کا انتظار تھا۔ اس کوچہ میں قدم رکھنے سے سب سے پہلے والدِ بزرگوار سے طریقہ چشتیہ میں بیعت کی۔ اور اس کا سلوک تمام کیا۔ پھر طریقہ قادریہ اخذ کیا اور تعلیم والدِ بزرگوار سے ہی حاصل کی اور خرقہ خلافت ...

باد سکندر بنیرہ شاہ کمال کیتھلی رح سے حاصل ہُوا۔ المختصر سترہ برس کی عمر میں عمرم جامع کمالات ظاہریہ و باطنیہ ہوکر والد بزرگوار کے سامنے ہی کتب درسیہ کی تعلیم و طریقہ کی تلقین فرمانے لگے۔ انہی دنوں میں سلسلہ کبرویہ کے مشہور بزرگ مولانا یعقوب خرمی رح سے سلسلہ کبرویہ حاصل کیا۔ ان تمام کمالات کے باوجود سلسلہ نقشبندیہ کی طلب قلب اطہر میں موجزن کیا ہوئی بڑھتے بڑھتے حد عشق کو پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ ۱۰۰۷ھ میں والدِ محترم نے دار فانی سے کوچ کیا تو بغرض حج بیت اللہ گھر سے نکل کر دہلی پہنچے۔ دہاں ملّا حسن کشمیری سے خواجہ محمد باقی باللہ نور اللہ تعالیٰ مرقدہ کی نسبت معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ پہلے بزرگ تھے سلسلہ نقشبندیہ کے جنہوں نے سرزمین ہند کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ کابل میں ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے شیخ خواجہ امکنگی رح کے حکم سے ہندوستان تشریف لائے۔ دہلی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ بڑے باکمال بزرگ تھے۔ صرف اکتالیس سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ شنبہ کے دن وفات پائی۔ وفات سے قبل صاحبزادگان کو شیخ مجدد کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ "اب امید حیات کم ہے" دہلی میں بیرون اجمیری دروازہ مزار مبارک مرجع عام و خاص ہے۔ آپ کے علو مقام کے لیے یہ کافی ہے کہ شیخ مجدد جیسی اولوالعزم شخصیت نے آپ کو اپنا پیر و مرشد بنایا ؎

مقام حضرت خواجہ رح نہ پوچھو مختصر یہ ہے کہ وہ تھے مرشد برحق مجدد الف ثانی کے

بہرحال آپ کا ذکر سُن کر محض ملاقات کی غرض سے تشریف لے گئے۔ قیام و بیعت کا قطعاً ارادہ نہ تھا۔ خواجہ بھی دیدآشنا تھے۔ لیکن نگاہ اوّل میں ہی دیکھ کر فرمایا اگر ممکن ہو تو ایک مہینہ یا کم سے کم ایک ہفتہ قیام کریں۔ آپ نے بھی بلا عذر قبول فرمالیا۔ صحبت کا اثر ایسے جلدی ہُوا کہ دو دن بعد آپ کی خواہش پر خواجہ نے خلاف معمول بلا استخارہ بیعت کرلی۔ آپ نے اڑھائی ماہ کا قلیل عرصہ قیام کیا۔ اس مختصر مدت میں نسبت نقشبندیہ جو دوسرا نام ہے "دوام حضور آگاہی" کا اور جس کی تعبیر حدیث پاک میں "کانک تراہ" سے کی گئی ہے، حاصل کرکے وہ کمالات حاصل کیے کہ "مالاعین رأت ولا اذن سمعت" کا مصداق ہیں۔ اس کے بعد دو مرتبہ سرہند سے دہلی آکر ملاقات کی، سب سے پہلی ملاقات میں کامل طریق سے

سلسلہ نقشبندیہ کے حصول کی بشارت ملی۔ دوسری مرتبہ خلعت خلافت عطا ہوئی اور خواجہ نے اپنے مخصوص ترین اصحاب کو تعلیم کے لیے آپ کے سپرد کیا۔ تیسری مرتبہ استقبال کو نکلے اپنے حلقہ میں آپ کو سرحلقہ بنا کر بٹھایا اور مریدین کو حکم دیا کہ شیخ احمد کی موجودگی میں میری طرف کوئی توجہ نہ کرے۔ اس مرتبہ رخصت کرتے ہوئے فرمایا "امید حیات بہت کم ہے۔ ضعف بہت معلوم ہوتا ہے۔" چنانچہ اپنے صاحبزادگان خواجہ عبیداللہ اور شیر خوار خواجہ عبداللہ کو آپ کے سپرد کر دیا۔

مرشد کی شہادت

خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ شیخ مجددؒ کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں تفصیل کا وقت نہیں مختصراً سنیں:

"شیخ احمد مردیست از سرہند، کثیر العلم وقوی العمل روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کرد، عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود باں ماند کہ چراغ شود کہ عالمہا ازو روشن گردد الحمد للہ تعالٰے احوال کاملہ او مرا یقین پیوستہ، شیخ احمد آفتابے است کہ مثل ہزارہا ستارہا در سایۂ او گم اند مثل ایشاں دریں وقت زیرِ فلک نیست و مثل ایشاں چند کس دریں امت گذشتہ اند، و ایشاں دریں وقت از کمل محبوباں اند۔"

(مقاماتِ ربانی ص۱۱)

اندازہ فرمائیں مرید تو پیر کی تعریف کیا ہی کرتے ہیں لیکن یہاں پیر جن خیالات کا اظہار کر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اور آپ نے بھی حقِ خدمت ادا کیا اور اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اپنے پیرزادوں خواجہ عبیداللہؒ اور خواجہ عبداللہؒ کو لکھتے ہیں:

"ایں فقیر از سر تا قدم غرق احسانہائے والد بزرگوار شما است، دریں طریق سبق الف از ایشاں گرفتہ است، و تہجی حروف ایں راہ از ایشاں آموختہ و دولت اندراج النہایہ فی البدایہ ببرکت صحبت ایشاں حاصل کردہ۔" (مکتوب نمبر ۲۴۷ دفتر اوّل حصہ چہارم)

اور مکتوب ۳۱ دفتر اوّل حصّہ اوّل میں فرماتے ہیں:

"تا آنکہ حق سبحانہٗ وتعالےٰ بمحض کرم خویش بخدمت ارشاد محض حقائق ومعارف آگاہی مؤید الدین الرضی شیخنا ومولانا وقبلتنا محمد الباقی قدس اللہ تعالےٰ بسرہ رسانید وایشاں بہ فقیر طریقہ علویہ نقشبندیہ تعلیم فرمودہ اند وبتوجہ بلیغ بحال ایں مسکین مرعی داشتند"

اِس عنوان کو ختم کرنے سے قبل دو واقعات ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلا یہ کہ خواجہ محمد الباقی رحؒ نے تیسری مرتبہ مجدّدؒ صاحب کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب مَیں نے ہندوستان آنے کے لیے استخارہ کیا تو بعد از استخارہ معلوم ہُوا کہ ایک خوب صورت طوطی میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا۔ مَیں لعاب دہن اُس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور وہ اپنے منقار سے شکر میرے منہ میں دے رہا ہے۔ اِس واقعہ کو مَیں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی رحؒ سے ذکر کیا تو فرمایا کہ "طوطی ہندوستان کا جانور ہے۔ وہاں تمہاری تربیت سے ایسا شخص ظاہر ہوگا جس سے ایک جہاں منوّر ہوگا اور تم کو بھی اس میں حصّہ ملے گا"، خواجہ نے اِس تعبیر کا مصداق آپ کو قرار دیا۔

دوسرا یہ کہ خواجہ نے اسی موقعہ پر فرمایا کہ مَیں جب ہندوستان آتے ہوئے سرہند پہنچا تو معلوم ہُوا کہ مَیں ایک قطب کے پڑوس میں اُترا ہوں۔ اور اس کا حلیہ مجھے بتایا گیا۔ جتنے درویش مجھے ملے نہ تو اس حلیہ کا ان میں کوئی تھا اور نہ صفت قطبیت کسی میں تھی۔ مَیں نے خیال کیا کہ آئندہ اِس شہر میں ایسا کوئی صاحبِ نصیب پیدا ہوگا، جب تمہارا حلیہ دیکھا تو وہی تھا جو مجھے دکھلایا گیا تھا۔ اور تم میں صفتِ قطبیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

؎ ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ظاہری کمالات

حضرت شیخ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع تھے۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ شکل و صورت اللہ نے ایسی دی تھی اور اتنی محبوب کہ ہر دیکھنے والا "تبارک اللہ احسن الخالقین"

کھڑا اُٹھتا۔ نیز یہ کہ طلبِ معاش کی فکر آپ کو کبھی دامن گیر نہ ہوئی۔ اور کیوں ہوتی کہ جس ذاتِ اقدس واطہر صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی سنّت کو زندہ کرنے کی غرض سے آپ کا وجود بنا تھا، اس کو حکمِ خداوندی تھا" وأمر اهلك بالصلاۃ واصطبر علیها لا نسئلك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوٰی ۔" (سورۃ طٰہٰ)

جہانگیر بادشاہ آخر میں آپ کا غلام بن گیا لیکن کوئی امداد قبول نہ کی۔ حتیٰ کہ مریدین میں سے کسی کو اس فکر میں مبتلا دیکھتے تو نصیحت فرماتے۔ چنانچہ مکتوب نمبر ۶۵ دفتر دوم حصہ ہفتم بنام مولانا محمد ہاشم رح خصوصیت سے ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

" بہرحال متوجہ احوال باطن باشند وطفیلی را ضروری دانند والفردرۃ تقدر بقدرہا الخ

امام ابوحنیفہ رح کی عظمت و رفعت اور تقلید کی ضرورت

اس علم و عمل کے باوصف جس کی تعریف آپ کے پیرِ مرشد نے کی، آپ امام ابوحنیفہ رح قدس سرہٗ کے مقلد تھے۔ امام صاحب کی عظمت و رفعت ان کے علوم واجتہاد اور تقویٰ و ورع کے متعلق مکتوبات میں بہت کچھ موجود ہے، پہلے ضرورت تقلید کے متعلق سنیں:

مکتوب نمبر ۲۷۲ دفتر اوّل حصہ پنجم میں فرماتے ہیں:

" قیاس واجتہاد اصل است از اصول شرعیہ کہ ما بتقلید آں ماموریم بخلاف کشف والہام کہ مارا بتقلید آں امر نہ فرمودند، الہام بر غیر حجت نیست واجتہاد بر مقلد حجت است پس تقلید علماء و مجتہدین باید کرد۔"

مسئلہ سماع واغنا کے متعلق مکتوب نمبر ۲۶۶ دفتر اوّل حصہ چہارم میں فرماتے ہیں:

" عمل صوفیا در حلت وحرمت سند نیست، ہمیں بس نیست کہ ما ایشاں را معذور داریم و علامت نکنیم وامر ایشاں را بحق سبحانہٗ و تعالےٰ مفوض داریم ایں جا قول امام ابی حنیفہ و امام ابی یوسف و

اور مکتوب ۲۳۴ دفتر اوّل حصہ اوّل میں فرماتے ہیں :

"تا آنکہ حق سبحانہ و تعالےٰ بمحض کرم خویش بخدمت ارشاد

محقق حقائق و معارف آگاہی مؤید الدین الرضی شیخنا و مولانا و

قبلتنا محمد الباقی قدسنا اللہ تعالےٰ بسرہ رسانید و ایشاں بہ فقیر

طریقہ علویہ نقشبندیہ تعلیم فرمودہ اند و توجہ بلیغ بحال ایں مسکین

مرعی داشتند"

اس عنوان کو ختم کرنے سے قبل دو واقعات کا ذکر ناگزیر طور پر ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلا یہ کہ خواجہ محمد الباقی رح نے تیسری مرتبہ مجدد صاحب کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے ہندوستان آنے کے لیے استخارہ کیا تو بعد از استخارہ معلوم ہوا کہ ایک خوب صورت طوطی میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں لعاب دہن اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور وہ اپنے منقار سے شکر میرے منہ میں دے رہا ہے۔ اس واقعہ کو میں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی رح سے ذکر کیا تو فرمایا "طوطی ہندوستان کا جانور ہے۔ وہاں تمہاری تربیت سے ایسا شخص ظاہر ہوگا جس سے ایک جہان منوّر ہوگا اور تم کو بھی اس میں حصہ ملے گا" خواجہ نے اس تعبیر کا مصداق آپ کو قرار دیا۔

دوسرا یہ کہ خواجہ صاحب نے اسی موقع پر فرمایا کہ میں جب ہندوستان آتے ہوئے سرہند پہنچا تو معلوم ہوا کہ میں ایک قطب کے پڑوس میں اترا ہوں۔ اور اس کا حلیہ مجھے بتایا گیا۔ جتنے درویش مجھے ملے نہ تو اس حلیہ کا ان میں کوئی تھا اور نہ صفت قطبیت کسی میں تھی۔ میں نے خیال کیا کہ آئندہ اس شہر میں ایسا کوئی صاحبِ نصیب پیدا ہوگا۔ جب تمہارا حلیہ دیکھا تو وہی تھا جو مجھے دکھلایا گیا تھا۔ اور تم میں صفتِ قطبیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

ع ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ظاہری کمالات

حضرت شیخ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع تھے۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ شکل و صورت اللہ نے ایسی دی تھی اور اتنی محبوب کہ ہر دیکھنے والا "تبارک اللہ احسن الخالقین"

کبھی اٹھتا نہیں یہ کہ طلب معاش کی فکر سے کوئی دن ایسا نہیں ہوتی۔ دل کیوں ہو کہ جس ذات اقدس واطہر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرنے کی غرض سے آپ کا وجود بنا تھا، اس کو حکم ہے۔ وامر اہلک بالصلوٰۃ واصطبر علیہا لا نسئلک رزقا نحن نرزقک والعاقبۃ للتقوٰی۔“

جہانگیر بادشاہ آخر میں آپ کا معتقد ہو گیا تھا اور قبولیت کی حیثیت سے ان میں سے کسی کو اس فکر میں مبتلا دیکھتے تو نصیحت فرماتے۔ چنانچہ مکتوب نمبر ۶۵ دفتر دوم حصہ ہفتم بنام مولانا محمد ہاشم خصوصیت سے ہمارے اس دعوٰی کی دلیل ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

”بہر حال متوجہ احوال باطن باشند و تحصیل ضروری دنیا بقدر الضرورۃ تقدر بقدر ہا الخ“

امام ابوحنیفہؒ کی عظمت رفعت اور تقلید کی ضرورت

اس علم و عمل کے باوصف جس کی تعریف آپ کے پیر و مرشد نے کی، آپ امام ابوحنیفہؒ قدس سرہٗ کے مقلد تھے۔ امام صاحب کی عظمت و رفعت ان کے علوم و اجتہاد اور تقوٰی و ورع کے متعلق مکتوبات میں بہت کچھ موجود ہے، پہلے ضرورت تقلید کے متعلق سنیں:

مکتوب نمبر ۲۷۲ دفتر اوّل حصہ پنجم میں فرماتے ہیں:

”قیاس واجتہاد اصل است از اصول شرعیہ کہ بتقلید آں ماموریم بخلاف کشف والہام کہ ما را بتقلید آں امر نفرمودہ اند الہام برغیر حجت نیست واجتہاد بر مقلد حجت است پس تقلید علماء مجتہدین باید کرد۔“

مسئلہ سماع و اغنا کے متعلق مکتوب نمبر ۲۶۶ دفتر اوّل حصہ چہارم میں فرماتے ہیں:

”عمل صوفیا در حلت و حرمت سند نیست، ہمیں بس نیست کہ ما ایشاں را معذور داریم و علامت نکنیم و امر ایشاں را بحق سبحانہ تعالےٰ مفوض داریم ایں جا قول امام ابی حنیفہ و امام ابی یوسف و

امام محمد معتبر است۔ نہ عمل ابی بکر شبلی و ابی الحسن نوری۔
سبحان اللہ! مسئلہ کی وضاحت کر دی اور تقاضائے ادب بھی سمجھا دیا کہ رتبہ سے جاننے والوں پر ملامت سے بچا لیا گیا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ
(البقرہ)

کاش دورِ حاضر کے متجددین واقعہ کو غور سے دیکھیں اور سبق حاصل کریں۔

امام ابوحنیفہؒ کے متعلق مکتوب نمبر ۵۵ دفتر دوم حصہ ہفتم میں فرماتے ہیں:

"مثل روح اللہ مثل امام اعظم کوفی است رحمۃ اللہ علیہ کہ ببرکت ورع و تقوی و بدولت متابعت سنت درجہ علیا در اجتہاد و استنباط یافتہ است کہ دیگراں در فہم آں عاجز اند و قاصر اند و فراست امام شافعی بہ کمی شمہ از دقت فقاہت او علیہ الرضوان دریافت کہ گفت الفقہاء کلہم عیال ابی حنیفہ۔ بے شائبہ تکلف و تعصب گفتہ می شود کہ نورانیت ایں مذہب حنفی بنظر کشفی در رنگ دریائے عظیم می نماید و سائر مذاہب در رنگ حیاض و جداول بنظر می آید الخ"

رعایت سنت

اتباع سنت سے جو حصہ وافر آپ کو ملا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک مرتبہ ایک خادم سے کسی جوش لوگوں میں سے چند دانے لانے کو فرمایا وہ چھ دانے لایا، تو فرمایا:
"ہمارے صوفی کو اب تک یہ بھی پتہ نہ چلا کہ عدد طاق کی رعایت سنت ہے۔
(اللہ وتر و یحب الوتر)"

مکتوب نمبر ۴۵ دفتر دوم حصہ ہفتم میں اتباع سنت کے سات درجے بیان فرما کر آخر میں لکھتے ہیں:

بالجملہ ہر دولتے کہ آمدہ است از برائے انبیاء علیہم السلام آمدہ است، سعادت آنہا است کہ بطفیل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات ازاں دولت بہرہ یابند و از پس ماندۂ ایشاں تناول نمایند۔

[illegible] ز قافلہ کہ او [illegible] دانم ترسم ایں بس کہ رسد ز دور بانگ جرسم

اکبری عہد کی ایک جھلک اِس سلسلہ کی تفصیلات مُلّا عبدالقادر بدایونی کی " منتخب التواریخ " سے ماخوذ ہیں: " بجائے توحید صریح شرک، عبادت آفتاب را روزے چہار وقت کہ سحر و شام و نیم روز و نیم شب لازم گرفتند الخ ص ۳۲۲ نیز قرار داند کہ بکلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ علانیۃ تکلیف نمایند۔ (ص ۲۰۳) نیز بجائے سلام مریداں چوں بہدگر ملاقات بکردند یکے اللہ اکبر دیگرے جلّ جلالہٗ گوید (ص ۳۵۶) سُود جُوا شراب کی حلت! ربوا و قمار حلال شد و دیگر محرمات برایں قیاس باید کرد، شراب مباح باشد و در مجالس نوروزی اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی و مفتی را نیز در وادی قدم نوشی آوردند، غسل فرضیت جنابت مطلقاً ساقط شد، داڑھی کی درگت! نوبت بایں جا رسید کہ بادشاہ کو حدیث دکھلائی گئی کہ پسر صحابی متریش در نظر آنحضرت آمد فرمودند کہ اہلِ بہشت بایں ہیئت خواہند بود (ص ۲۷۸) العیاذ باللہ۔ سارداایکٹ یا عائلی قوانین جس کی رو سے چچا زاد اور خالہ زاد ہمشیرہ سے نکاح منع تھا نیز سولہ سال سے کم عمر لڑکا اور چودہ سال سے کم عمر لڑکی نکاح نہیں کر سکتی تھی نیز حضرت عائشہ سلام اللہ علیہا بوقتِ رخصتی یعنی نو برس کا بالکل انکار تھا، نیز بیشتر از یک نکاح نکنند کہ خدا یکے و زن یکے، نیز لڑکی کی عمر کی تحقیق کے لیے باقاعدہ معائنہ ہوتا (ص ۳۹۱) پردہ حکماً جوان عورتیں کوچہ و بازار میں چہرہ کھلا رکھیں (ص ۳۹۱)۔ پرمٹ پر زنا خاص آبادیاں تھیں یعنی قحبہ خانے۔ ختنہ بارہ سال سے کم عمر میں اس کی اجازت نہیں پھر لڑکا خود مختار ہے۔ (ص ۳۷۶) میت ابتداء سر مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی طرف کر کے دفنانے کا حکم تھا (ص ۳۵۷) پھر حکم ہوا کہ خام غلہ اور پکی اینٹیں باندھ کر سپرد آب کرو ورنہ چینیوں کی طرح درخت پر لٹکا دو۔ "

کہاں تک لکھیں ع " قیاس کن زگلستان اکبر " بہار او (بہ ترمیم) اِس

دینِ جدید کے جو آڑے آتا قتل کر دیا جاتا۔ اس زمانہ کے شہداءِ حق کی فہرست بڑی طویل اور دردناک ہے (ان پر خدا کی کروڑوں رحمتیں ہوں۔)

اصلاحی کوششیں اور ان کے اثرات

حضرت مجدّد رح نے اس دور میں خطوط وغیرہ کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کی۔ بڑے بڑے امراء و وزراء کو طویل خط لکھے، کتابیں لکھیں۔ باقاعدہ سلسلہ تبلیغ شروع کیا، تا آنکہ جہانگیر تخت کا وارث بنا؛ اس سلطنت کو نفس اسلام سے عناد نہ تھا مگر نشہ شاہی شباب پر تھا۔ اور نئے بادشاہ "الشباب شعبۃ من الجنون" کے تحت سجدۂ تعظیمی کا حکم صادر فرما چکے تھے۔ پھر بزور فتویٰ حاصل کیا گیا، اس پر طرہ یہ کہ ملکہ نور جہاں عنانِ حکومت کی اصل مالک تھی، جو سُنّیوں کے معاملہ میں انتہائی متعصب تھی، غرض شرک و بُت پرستی کا سیلاب ایک طرف، بدعات کا سیلاب اس پر مستزاد، شریعت و طریقت کی تفریق اور مصیبت! لیکن اپنی کوششوں میں آپ مصروف ہیں۔ مکتوبات کے مطالعہ سے آپ رح کی مساعی اور اس کے نتائج کا پتہ چلتا ہے۔ مکتوب ۳۳ دفتر اوّل حصہ اوّل میں علماءِ سوء کی خوب خبر لی۔ پھر مکتوب ۴۷ دفتر اوّل حصہ دوم بنام شیخ فرید مقرب خاص بادشاہ جہانگیر کو بادشاہ کی حالت کی طرف متوجہ کراتے ہوئے جیّد علماء کی صحبت پر زور دیتے ہیں۔ قدرت خداوندی بادشاہ مان جاتا ہے اور چار عالم منتخب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

مکتوب ۵۳ دفتر اول حصہ دوم میں اظہارِ مسرت کے ساتھ پھر توجہ دلاتے ہیں کہ صحیح عالم منتخب کرو، اگرچہ ایک ہی ہو۔ غرض اس قسم کی اصلاحی کوششوں سے جاہل صوفیاء اور دنیا پرست علماء کو اپنی کساد بازاری کے خطرہ نے آمادۂ مخالفت کیا۔ عظیم سازش تیار کی جو "ان کان مکرھم لتزول منہ الجبال" کا مصداق تھی۔ انتہا یہ کہ اس مکروہ پروپیگنڈا سے شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رح جیسے حضرات بھی متاثر ہو جاتے ہیں جنہوں نے بعد میں جلد ہی حالات سے آگاہ ہو کر توبہ کی۔ بعد میں شیخ اور مجدّد علیہما الرحمہ کے تعلقات بڑے اچھے ہو گئے (دیکھیں مکتوبات)

آپؒ کے چند خطوط میں قطع و برید کر کے دربار میں پیش کیے گئے اور یہ باور کرایا گیا کہ شیخ احمد اپنے آپ کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے افضل گردانتا ہے، القصہ طلبی ہوئی۔ تشریف لے جا کر بادشاہ کو سمجھایا۔ کلمہ حق نے کام کیا۔ شاہ مطمئن ہو گیا۔ لیکن دنیا پرست کب باز آنے والے تھے، دوسرا سٹنٹ اختیار کیا۔ بادشاہ کو باور کرایا گیا کہ یہ شخص سجدۂ تعظیمی کا منکر ہے یقین نہ ہو تو امتحان کر لیں۔ پھر طلبی ہوئی، جہانگیر نے سجدے کا مطالبہ کیا لیکن محمد مدنی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا غلام یہ کیسے مان لیتا۔ جواب میں فرمایا "بجز خلاقِ جہاں کسی کے لیے سجدہ روا نہیں۔ او جہانگیر کتنی حماقت و لطالت ہے کہ اپنے جیسے عاجز کے سامنے جھکوں؟"، یہ سننا تھا کہ بادشاہ کا غصہ اُبل پڑا۔ حضور علیہ السلام کے متعلق جو جسارت خسرو پرویز نے کی تھی وہی جسارت بھٹکا ہوا جہانگیر محمد علیہ السلام کے غلام کے لیے کر رہا ہے یعنی سزائے موت! لیکن اچانک اسے منسوخ کر کے سنتِ یوسفی و محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل کے لیے "گوالیار" کے قلعہ "اجین" بھجوا دیا، گدڑی پوش نے قلعہ کو زینت بخشی رنگ بدل گئے۔ دو سال گذر گئے۔ آپؒ کی کرامت کا ظہور ہوا۔ جہانگیر کے مقدر کا ستارہ چمک اُٹھا۔ خواب میں سید الابرار علیہ التحیۃ والسلام کو دیکھا۔ آپ بطور تاسف انگلی دانتوں میں دبائے ارشاد فرما رہے ہیں "جہانگیر تم نے کتنے بڑے آدمی کو قید کر دیا۔" بعد از خواب حکم رہائی دے کر ملتجی ہوا کہ چند دن ہم نشینی چاہتا ہوں؟ آپؒ نے منظور کیا۔ یہ صحبت چند روزہ رنگ لائی، جام و سبو توڑ ڈالے، نشہ حکومت اُتر گیا، ہر وقت رونے سے واسطہ ہے۔ پھر ایک دفعہ فقیر کے لنگر کا کھانا کھا کر لطف اندوز ہوا۔ اور اسے زندگی کا بہترین کھانا قرار دیا۔ سوز و گداز بڑھی۔ آخر عمر میں کہا کہ "عمر بھر کوئی کام نہیں کیا۔ ایک دستاویز ہے اسے داورِ محشر کی عدالت میں پیش کر دوں گا" وہ یہ کہ ایک مرتبہ شیخ نے فرمایا تھا کہ خدا ہمیں جنت لے گیا تو تجھے ساتھ لیے بغیر نہیں جائیں گے۔" اسی پر بس نہیں شاہ جہاں آپؒ کا مرید ہوا پھر غازی عالمگیرؒ آپؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کا مرید ہوا! کون عالمگیر؟ قرآن کا کاتب اور ٹوپیاں بنا کر انہیں فروخت کر کے نانِ [illegible] والا۔ فتاویٰ عالمگیری لکھوا کر از برما تا تاشقند نظامِ اسلامی

کو نافذ کرنے والا ! یہ برکات تھیں امام ربانی کی اور آپؒ کے مجدد ہونے کی !

آپؒ کی زندگی میں ایک وقت وہ بھی آیا جب جنرل مہابت خاں مرحوم نے جہانگیر اور نور جہاں کو قید کرکے آپؒ کو لکھا " بیا تخت شاہی خالی است " تو جواب میں لکھا " فقیر را با تخت شاہی چہ کار "

باطنی کمالات

اس سلسلہ میں اس سے پہلے آپؒ کے پیر و مرشد کے جو ارشادات گذر چکے ہیں وہ کافی و شافی ہیں تاہم ایک دو اور شہادتیں ملاحظہ فرمائیں -

تیرہویں صدی کے مجدد اور عظیم عالم و صوفی شاہ غلام علی دہلوی رح اپنے مکتوب کے صا۱۴۱ پر مطبوعہ مدراس میں فرماتے ہیں :

" وحضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بعد تحریر مناقب حضرت ایشاں نوشتہ اند لا یحبہ مومن ولا یبغضہ الا منافق شقی "

کتنا بڑا مقام ہے شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ غلام علی صاحب علیہما الرحمہ جیسے مجدد دین امت کی اس شہادت کے بعد کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں - تاہم شہید اعظم مرزا مظہر جانجاناں شہید علیہ الرحمہ کی شہادت نہ لکھنا بڑی ناانصافی ہوگی - فرماتے ہیں :

" ایک مرتبہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا سے مشرف ہوا - گویا آپؐ کی بغل میں لیٹا ہوں اور آپؐ کی مبارک سانس مجھے لگی - معاً پیاس محسوس ہوئی - سرہندی شہزادے بھی تھے - ان سے نبیٔ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پانی لانے کو فرمایا - ا نے عرض کی یہ میرے مخدوم زادے ہیں - آپؐ نے فرمایا اب میرا حکم ہے - غرض پانی آیا - وہ نوش فرمایا تو حضرت مجدد رح کے متعلق سوال کیا - اس پر فرمایا کہ میری امت میں ان جیسا کون ہے ؟ میں نے مکتوبات کے متعلق عرض کیا تو پڑھ کر سنانے کو فرمایا ، میں نے حضرت حق کی حمد و ثنا کے متعلق " انہ تعالیٰ وراء الوریٰ ثم وراء الوراء " پڑھ کر سنایا - آپؐ نے بہت پسند فرمایا - دیر تک

بار بار سُنے اور تحسین فرمائی۔"

ان شہادتوں کو پڑھ کر ذرا مولوی محسن الملک مرحوم کو سنیں۔ فرماتے ہیں :

"اگر حضرت عمر فاروق رضؓ کی ذات بابرکات نہ ہوتی تو ہندوستان میں اتنے مسلمان نہ ہوتے۔" (آیات بینات)

کتنا سچ فرمایا! ذرا آگے بڑھیں خانوادہ فاروقی کے رجال، عاظم حضرت مجدد فاروقی سرہندی، حکیم الہند شاہ ولی اللہ فاروقی اور ان کا خاندان، امیر المجاہدین حاجی امداد اللہ مہاجر مکی فاروقی، حکیم الامت مولانا تھانوی فاروقی، امام اہلسنت مولانا عبد الشکور لکھنوی فاروقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے جد بزرگوار کے اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے مسلمانان ہند کے دین و ایمان کی حفاظت فرمائی۔

یہ بھی فیض مجدد ہی ہے کہ سرزمین ہند کو جس مجدد نے سب سے پہلے اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا وہ آپ ہی تھے۔ ورنہ پہلے یہ سرزمین اس شرف سے محروم تھی اور پھر تو سلسلہ چل نکلا۔ آپؒ کے بعد امام شاہ ولی اللہ، امیر سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، شاہ غلام علی، مولانا تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ اکابر بلاشبہ مجددین امت ہیں۔

اتباعِ سنّت و اجتناب عن البدعت

مجدد کی زندگی کا صحیح ... اس موڑ پر آ کر ملتا ہے

سطورِ بالا میں آپ نے اس سمندر کے دھندلے سے نقوش دیکھے۔ انصاف آپ کے ذمہ!

اب مکتوبات کو ملاحظہ فرمائیے! مکتوب ۱۰۵ دفتر سوم بنام شیخ حسن برکی میں حدیث نبوی "من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید" نقل کر کے اتباعِ سنّت پر جو زور دیا ہے وہ قابلِ دید ہے۔

مکتوب ۲۳ دفتر دوم بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد عبد اللہ رحمہ تقسیم بدعت یعنی حسنہ و سیئہ کے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

"پچھلے لوگوں نے بدعت میں شاید کوئی اچھائی دیکھی ہوگی کہ اس کے بعض افراد کو مستحسن قرار دیا لیکن فقیر اس مسئلہ میں ان کی موافقت

نہیں کرسکتا اور بدعت کے کسی فرد کو حسنہ نہیں جانتا۔ اور بدعت
میں بجز گندگی و تاریکی کچھ محسوس نہیں کرتا۔ بدعت کو یہ فقیر کدال
کی طرح جانتا ہے جو اسلام کی عالیشان عمارت کو ڈھا رہی ہے۔"

آگے بڑھیں مکتوب ۵۴ دفتر اوّل بنام شیخ فرید رح!
"یقین تصوّر فرمایند کہ فساد صحبت مبتدع زیادہ از فساد صحبت کافر است"
اللہ اللہ حرکت رگ فاروقی ملاحظہ فرمائیں اور بدعت سے تنفر اور سنّت میں انہماک
کے جذبہ صادقہ کو دیکھیں۔ کیوں نہ ہو ارشادِ نبویؐ یوں ہی ہے" من شاء فلیراجع"
اس سے آگے اس عنوان پر کسی چیز کی ضرورت نہیں اب مقام مجدّدیت کا نمبر
ہے۔ لیکن قاری محمد طیب صاحب کے ارشاداتِ عالیہ اور رشحاتِ فکر نقل کرنے
کے بعد اس عنوان پر کیا لکھوں سورج کو چراغ دکھانا عقل مندی نہیں اور اپنے اکابر
سے جو تعلق ہے اس کے پیشِ نظر یہ گستاخی نہیں کرسکتا۔ پس آپؒ کی شانِ عزیمت
مجدّدیت پر ایک فرزند دیوبند کا ارشاد سُن لیں اور اس پر یہ عنوان مکمل ہوجاتا ہے۔

ابن حنبل رح نے کیا تھا کام جو ۔۔۔ اس نے وہ کرکے ہمیں دکھلا یا

باقیات صالحات

اختتام سے قبل اس عنوان سے چند سطور ضروری ہیں، اس سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں فرزندانِ گرامی قدر وخلفاء اور آپؒ کی تصانیف! اس پر تفصیلی گفتگو فی الحال مشکل ہے۔

مختصراً یہ کہ تصانیف میں مکتوبات سرفہرست ہیں، ان کے بیسیوں حوالے اوپر
گذرے لیکن نسبت سمندر اور قطرے کی ہے فی الحقیقت امام کے مکتوبات سینکڑوں
تصانیف کا حکم رکھتے ہیں اور انسانی زندگی کے لیے کافی وشافی ہیں، زندگی کے
ہر مسئلہ کا حل ان میں ہے جو چاہے تجربہ کرکے دیکھ لے، علاوہ ازیں معارف لانیہ
رد روافض، اثبات النبوت، شرح رباعیات، "تعلیقات عوارف، رسالہ علم حدیث
حالات خواجگان نقشبند، مبداء و معاد، تعین ولاتعین، رسالہ تہلیلیہ،
مکاشفات غیبیہ، آداب المریدین، وحدت الوجود، تحقیق قیومیت، مقصود الصالحین
مشہور ہیں۔

فرزندان گرامی قدر۔ خواجہ محمد صادق رح ولادت ۱۰۰۰ھ وفات ۹ اربیع الاوّل

۱۰۲۵ھ سب سے بڑے ہیں، عالم جوانی میں آبا میاں کے سامنے راہی ملک بقا ہوئے۔ آپؒ کو بڑا صدمہ تھا۔ کمالات صادق کا ذکر مکتوبات میں ہے۔

پھر خواجہ محمد سعیدؒ ہیں ولادت ۱۰۰۵ھ وفات ۲۰ جمادی الثانی ۱۰۷۰ھ معروف بخازن الرحمۃ پھر خواجہ محمد معصوم معروف بہ عروۃ الوثقیٰ ہیں۔ سلسلہ کی اشاعت سب سے زیادہ ان سے ہوئی۔ عالمگیرؒ کے شیخ تھے۔ دہلی کی مشہور عالم خانقاہ اور اب پاکستان میں خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں ضلع میانوالی آپؒ ہی کے سلسلہ سے متعلق ہیں۔ ولادت ۱۰۰۷ھ وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ۔ چوتھے صاحبزادے شاہ محمد یحییٰ تھے۔ آبا میاں کی وفات کے وقت ۹ برس کے تھے تحصیل علوم و طریقہ بھائیوں سے کی۔ وفات ۱۰۹٦ھ

رہ گئے خلفاء تو ان کا کیا حساب؟ ہندوستان کا کوئی شہر آپؒ کے خلفاء سے خالی نہیں۔ پچاس خلفاء تو صرف انبالہ میں تھے۔ پھر دیارِ عرب، غزنی، کابل، بخارا، سمرقند وغیرہ میں خدام شیخ کی کتنی کثرت ہے کہ لاتعد و لاتحصی، اور سب نے علوم امام سے اس جہان ظلمت و تاریکی کو منور کیا جزاہم اللہ تعالیٰ۔

مولانا نسیم احمد مجددی فاروقی امروہوی نے آپؒ کے خلفاء کے حالات کے سلسلہ میں تحقیقی کام کیا ہے۔ شائقین حضرات ان سے رابطہ قائم کریں (بواسطہ الفرقان لکھنؤ) پھر آپ کے علوم و معارف کی ایک زندہ جاوید یادگار دنیا کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ روایات مشہورہ و متواترہ کے پیش نظر آپؒ نے اس مقام سے گذرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے یہاں سے بوئے علم آرہی ہے"۔ چنانچہ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس دور تجدد میں حضرت مجدد کے علوم و معارف کو دارالعلوم دیوبند کس طرح ایک مقدس امانت سمجھ کر سنبھالے ہوئے ہے اور بانیانِ دیوبند کے روحانی و علمی رشتے جس طرح اس قدسی صفت بزرگ سے ملتے ہیں۔ اس سے اربابِ نظر آگاہ ہیں، تو گویا وجود دارالعلوم بھی آپ کے باقیات صالحات میں ہے اور اسے شمار نہ کرنا ایک عظیم ناانصافی ہوگی۔ ایسی روایات حضرت الامیر سید احمد شہید رحمہ کے متعلق بھی مشہور ہیں کہ انہوں نے جہاد کی مہم کے دوران اس جگہ سے گذرتے ہوئے بعینہٖ وہی الفاظ ادا فرمائے

تھے اور ان روحانی رشتوں سے بھی دنیا آگاہ ہے۔

خاتمۂ سخن | بالآخر وہ مجدد الف ثانی رح قطب زمان اور صاحب عزم واستقامت جس کی حق وراستی کی آواز کے سامنے باطل کو سرنگوں ہونا پڑا۔ اس کا وقت موعود آگیا۔ سچ ہے کل نفس ذائقۃ الموت۔

؎ موت ہے آخر کوئی کتنا ہی ہو صاحب کمال
حی وقیوم اک فقط ہے ذات رب ذوالجلال

لیکن انہیں اس کا صدمہ نہ تھا اور کیوں ہوتا محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو جب وصال وحیات میں انتخاب کا حکم ہوا تو آپؐ نے "رفیق اعلیٰ" سے وصال کو ترجیح دی اور فرمایا "الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب"۔ آپؐ کا ایک سچا خادم کیوں پریشان ہوتا؟ اسے تو خوشی تھی۔ عمر کے آخری شعبان میں شب برات کو عبادت کے لیے خلوت خانہ میں تشریف لے گئے۔ علی الصبح اہلیہ محترمہ نے کہا کہ نہ معلوم آج کی رات کس کس کا نام دفتر ہستی سے کاٹا گیا ہے؟ فرمایا گیا تم بطور شک کہہ رہی ہو؟ اس شخص کا کیا حال ہوگا جس نے اپنا نام محو ہوتا خود دیکھا۔ اس کے بعد ہدایت وارشاد کا سارا کام صاحبزادگان کے سپرد کرکے خلوت کو زیادہ پسند فرمانے لگے۔

؎ وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتش عشق تیز تر گردد!

وسط ذی الحجہ میں ضیق نفس کی بیماری کا شکار ہوئے۔ تپ محرقہ اس پر مستزاد! حتےٰ کہ بارہ محرم الحرام کو فرمایا کہ بس ۴۰، ۵۰ دن کے اندر یہاں سے سفر کرنا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ سہ شنبہ بعمر ۶۳ سال اس جہان فانی سے راہی ملک بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ اللہ متابعت نبویؐ اور محبت صدیقؓ وفاروقؓ کا کیا صلہ ملا! گنبد خضرا کے وہ تینوں مکیں اسی عمر میں دار آخرت کو سدھارے تھے۔ "رفیع المراتب" مادہ تاریخ ہے۔ جس صبح انتقال ہوا اس رات حسب معمول تہجد پڑھی۔ بعد از فراغت خدام سے فرمایا کہ "تم نے تیمارداری کی بڑی تکلیف کی آج یہ تکلیف ختم ہے" آخر وقت میں اسم ذات کا بہت غلبہ تھا۔ اسی حال میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

فرزندِ ثانی خواجہ محمد سعید رح نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور فرزندِ اکبر خواجہ محمد صادق کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ دفن اس مقام پر ہوئے جس کے متعلق "مکتوبات" میں ہے کہ "میرے قلب کے انوار وہاں چمکتے ہیں"، مزار مرجع خلائق ہے اور دورِ ظلمت و بدعت میں ہر قسم کی آلائشوں سے پاک! اور یہ ایک واضح کرامت ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

حضرت مجنوں کلکتوی نے آستانِ شیخ پر بڑی دردناک نظم لکھی۔ حرفِ آخر اسے بناتا ہوں:

الا اے دولتِ طالع تو یابی صد وقار ایں جا
زر ایں جا گنج ایں جا شوکت ایں جا افتخار ایں جا
بوئے روضہ چوں رفتم ز شرح صدر دانستم
دل ایں جا مدعا ایں جا امید ایں جا قرار ایں جا
خیال ساقیٔ زمزم عجب پر کیف اثر دارد
خم ایں جا ساغر ایں جا بادہ ایں جا بادہ خوار ایں جا
ز داغِ عشق شاہم سینہ گلزار جناں دارم
گل ایں جا نرگس ایں جا سنبل ایں جا لالہ زار ایں جا
سرا ہم ہمچوں مجنوں در جوار روضۂ اقدس
من ایں جا زندگی ایں جا اجل ایں جا مزار ایں جا

ان نقوش کو پڑھ کر ایک بار پھر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا ابتدائی جملہ پڑھیے اور سوچیں کہ شہنشاہ اقلیم خطابت و بلاغت نے "عشاق" کے متعلق کتنا بلیغ جملہ ارشاد فرمایا؟ اللہ تعالےٰ ہمیں شیخ مجدد کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ الحاد و بدعت اور تجدد و مغربیت کی آندھیوں سے بچائے اور کوئی وارثِ مجدد پیدا کر کے نئے دینی فتنوں کا سدِ باب کرے۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

کتابیات
سیرت الخلیل

رِقّت و رحمت کا پیکرِ مجسّم

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی کی ذات قارئینِ "حکمتِ قرآن" کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ مولانا کے متعدد مقالات حکمتِ قرآن کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔ موصوف آج کل قرآن اکیڈمی میں بطور مدرس اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ "سیرت الخلیل" کے نام سے مولانا کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کے دو ابواب اس سے قبل وقفوں وقفوں سے "حکمتِ قرآن" کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب قریباً ½ ۱ سال کے وقفہ کے بعد اس سلسلے کا دوبارہ اجراء کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

کسی بشر کا نبوّت سے سرفراز ہو جانا ہی یہ سمجھنے اور یقین کر لینے کے لیے بہت کافی ہے کہ وہ تمام انسانی خوبیوں سے آخری حد تک مالا مال ہے۔ سورۃ حج کی آیت ۷۵

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ	"اللہ انتخاب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے پیام پہنچانے والے اور آدمیوں میں سے بھی۔"

میں اس حقیقت پر متنبّہ کیا گیا ہے کہ ملائکہ اور انسانوں میں سے جس جس کو بھی رسالت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے وہ اپنی اپنی نوع کے بہترین افراد ہوتے ہیں، اسی طرح سے سورۃ ص کی آیت ۴۷

وَاِنَّھُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ ؕ	"اور بے شک یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں ہیں"

میں بالخصوص ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اور پوتے اسحٰق و یعقوب علیہما السلام کی صفوت و خیریت کی وہ غیر فانی گواہی اور لازوال اعلان مذکور ہے جس کے بعد ابوالانبیاء

کی بابت مزید کچھ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

ابراہیم علیہ السّلام خدا تعالےٰ کے پسندیدہ وہ انسانِ کامل تھے جس کی انسانیت ہر قسم کے کھوٹ سے مبرّا تھی، ان کے عظیم تر صفات و کمالات میں ایک بہت بڑا کمال یہ تھا کہ وہ خود تو شدید سے شدید تر حالات کا بھی بڑی پامردی سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور کسی مرحلے پر بھی عزیمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے لیکن دوسروں کے لیے ہمیشہ رخصت و سہولت کے طالب رہے۔

تمام انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والتسلیمات کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ تمام لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ اپنے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے ساتھ بھی مبالغہ آمیز حد تک نرمی برتتے ہیں اور انسانیت کی خیر خواہی میں ناقابلِ یقین حد تک ایثار و ہمدردی سے کام لیتے ہیں۔ اس کی بہت زیادہ واضح اور نمایاں مثالیں تو خدا تعالےٰ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی میں اس کثرت سے بکھری ہوئی نظر آتی ہیں جن کا احصاء مشکل ہے، اس وجہ سے بھی کہ ان کی زندگی کی ساری تفصیلات ہم تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جبکہ دوسرے انبیاءؑ کی زندگیاں اس طرح تفصیل سے محفوظ نہیں اور شاید اس وجہ سے بھی کہ بندگی و عبودیّت کے دوسرے مظاہر کی طرح خاتم الانبیاءؐ کی زندگی میں دلسوزی کے مظاہر کی بھی فی الواقعہ بہتات ہے۔ مگر خلیل اللہ علیہ السّلام کی زندگی میں بھی ایسے واقعات کی کچھ کمی نہیں، قرآن و حدیث میں ان کی زندگی کی جتنی کچھ تفصیلات میسّر ہیں، اس میں سے چند ایک ایسے واقعات کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے۔

توحید کی دعوت پیش کرنے پر جب ان کے والد آزر ان سے سخت ناراض ہوئے اور پھر اس قدر بگڑ گئے کہ آپؑ کی سنگساری کا عندیہ ظاہر کیا اور آپؑ کو ایک طویل مدّت تک گھر سے نکلنے اور دُور رہنے کا حکم دیا تو ابراہیم علیہ السّلام نے اس کج ادائی کا جس انداز سے سامنا کیا وہ نہ صرف ادب و توقیر کا بے مثال نمونہ ہے بلکہ غور کرنے پر دردمندی و دلسوزی کا وہ رِقّت آمیز منظر آنکھوں کے سامنے لاتا ہے جس پر آنسوؤں بہائے بغیر رہا نہیں جاتا۔ سورہ مریم میں ہے:

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ	(آزر نے کہا) تو کیا ابراہیمؑ تم میرے
اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ	معبودوں سے پھرے ہوئے ہو۔ اگر

لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ۝ (آیات ۴۶، ۴۷)

تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر ڈالوں گا اور مجھے تو ایک مدت کے لیے چھوڑ ہی دو۔ بولے آپ میرا سلام لیں اب میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت کی درخواست کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر بیحد مہربان ہے

حق صریح سے انحراف اور اس پر مستزاد ان بے تکی باتوں پر کون بیٹا ہے جو نہ صرف یہ کہ جواب میں سختی اور درشتی سے پہلو بچا سکے بلکہ سلامتی کی دعا اور اُس کے لیے استغفار کا وعدہ بھی کرے اور پھر اس دعا و استغفار کا سلسلہ دنیا میں اُس وقت تک برابر جاری رہے جب تک کہ باپ کی زندگی کے آخری لمحات تک اس کا خدا تعالیٰ کی دشمنی پر قائم رہنا اور خاتمہ بالکفر واقع ہونا اُس پر عیاں نہ ہو۔ سورہ توبہ میں ہے:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ۝ (آیت ۱۱۴)

پھر جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو اس سے بے تعلق ہو گئے، بے شک ابراہیمؑ بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک حدیث میں تو یوں وارد ہے کہ:

یلقی ابراھیم ابا ہ یوم القیامۃ وعلی وجہہ قترۃ وغبرۃ فیقول ابراھیم الم اقل لک لا تعصنی فیقول ابوہ الیوم لا اعصیک فیقول ابراھیم یا ربّ انّک وعدتنی ان لا تخزنی یوم یبعثون فای خزی اخزی من

ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے والد کو اس حالت میں دیکھ لیں گے کہ اس کا چہرہ سیاہ غبار آلود ہو گا۔ ابراہیم علیہ السلام ان سے کہیں گے کہ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میری مخالفت نہ کرو ان کا باپ جواب دے گا کہ آج تمہاری مخالفت نہیں کروں گا۔ تو ابراہیم علیہ السلام باری تعالیٰ سے درخواست

الی الا لعد فیقول اللّٰہ تعالیٰ انّی حرمتُ الجنّۃ علی الکافرین ثم یقال یا ابراھیمؑ ما تحت رجلیک فینظر فاذا ھو بذیخ متلطخ فیوخذ بقوائمہ فیلقی فی النّار۔

کریں گے کہ اے رب تُو نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا تھا کہ تجھے اس دن رسوا نہیں کروں گا جبکہ لوگوں کو زندہ کیا جائے گا تو آج اس سے بڑی کیا رسوائی ہوگی کہ میرے والد تیری رحمتوں سے دُور ہے۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرمائیں گے کہ مَیں نے جنّت کو کافروں پر حرام کردیا ہے۔ پھر ابراہیمؑ سے کہا جائیگا کہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھو۔ چنانچہ ایک جانور (بجّو) خون آلود ہوگا۔ پھر اس کو پیروں سے پکڑ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (بخاری بحوالہ ردح)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدنصیب باپ کا یہ فرزند سعادت مند قیامت کی ان ہولناک گھڑیوں میں بھی جبکہ ہر طرف "نفسی نفسی" کی صدا و پکار ہوگی، اپنی بے مثال رأفتُ رحمت کی بدولت[1] اپنے خطاکار والد کی خطاپوشی کی درخواست کر بیٹھیں گے، اور

---

[1] اس مقام پر یہ واضح تفسیری پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ جبکہ ابراہیم علیہ السّلام کو اپنے والد آزر کا خاتمہ بالکفر ہونا محقق ہوگیا تھا اور مشرکین کے لیے ممانعتِ استغفار کے حکمِ الٰہی کے بموجب اُن سے تبرّی بھی کیا تھا تو پھر قیامت کے دن اس استغفار کی کیا وجہِ جواز ہے۔ علمائے تفسیر نے اس سوال کے متعدد جوابات دیئے ہیں جن میں سے اکثر کسی قدر لفظی یا معنوی ضعف سے خالی نہیں ہم اپنے ذوق کو اس جواب پر سب سے زیادہ قانع پاتے ہیں کہ جس طرح ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ دنیادی میں اکثر و بیشتر ان کی رقّت و رحمت کا ظہور ہوتا رہتا تھا قیامت میں بھی اپنے باپ کو اس بدحالی میں دیکھ کر اس قدر متاثر اور مغلوب الحال ہوجائیں گے کہ ممانعت کا علم ہونے کے باوجود اس ممانعت کی طرف دھیان نہیں رہے گا اور بے قابو ہوکر مجبور دلی زبان سے باپ کی مغفرت اور نجات کے لیے عرض داشت پیش فرما ہی دیں گے۔ اب حد سے حد یہی اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا کاملین پر بھی

والد کی بدحالی پر درد کی ٹھیسیں اُس کے دل میں اُس وقت تک برابر اُٹھیں گی جب تک کہ مسخ صورت کی ایک خاص تدبیر سے محبتِ پدری کو ان کی سرشت سے کھینچ کر نکال باہر نہیں کیا جاتا۔

ایک دوسرے موقعہ پر قرآنِ حکیم کا بیان ہے کہ قوم لوط کی تباہی و بربادی کا پروانہ الٰہی لے کر جب فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھی بیٹے کی قبل از ولادت خوشخبری دینے کے لیے تشریف لائے تو آپؑ نے اس آمد کی اصل غرض و غایت کے متعلق ان سے استفسار فرمایا جس پر فرشتوں نے خدا تعالےٰ کے حکم سے اہلِ سدوم کی ہلاکت کے پروگرام سے آگاہ کیا تو آپؑ کی رقتِ درحمت یہاں بھی حرکت میں آئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ فرشتوں سے جھگڑنے لگے اور بدنصیب سدومیوں کے لیے مزید مہلت

غلبۂ حال ہوجاتا ہے۔ سو اس کا جواب اثبات میں ہے) اس کی ایک نظیر قرآنی آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط (سورہ توبہ۔ آیت ۹) سے حضور علیہ السلام کا تخییر و تحدید سمجھنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نہ تو پہلے جملے سے تخییر مراد ہے کہ استغفار و عدم استغفار میں سے جو بھی پسند ہو اختیار کر لیجئے اور نہ ہی دوسرے جملے سے تحدید مقصود ہے کہ ستر دفعہ استغفار کرو گے تو مغفرت نہیں کروں گا لیکن اگر اس سے زیادہ کرو گے تو کروں گا بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لیے ہے لیکن منقول ہے کہ نبی علیہ السلام نے اس موقع پر فرمایا کہ "خُيِّرْتُ فاخترتُ وسازيدُ على السبعين" تو کیا نبی علیہ السلام کو اس اسلوبِ عربی کا یہ مدلول معلوم نہ تھا۔ مولانا تھانوی رح فرماتے ہیں کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رح نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالتِ رحمت کے غلبے کی وجہ سے اس وقت نبی علیہ السلام نے معانی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفسِ الفاظ سے تمسک فرمانے لگے اور نفسِ الفاظ میں تخییر و حصر کی گنجائش ضرور ہے۔ گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ حال کا یلین پر بھی کبھی ہوجاتا ہے۔ (بحوالہ اشرف الجواب حصہ دوم)

نکالنے کے لیے کوشش کرنے لگے، سورۃ ہود میں ہے :

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝

(آیات ۷۴/۵/۷۶)

پس جب گیا ابراہیمؑ سے ڈر اور آئی اُس کو خوش خبری جھگڑنے لگا ہم سے بیچ قوم لوطؑ کے تحقیق ابراہیمؑ البتہ تحمل والا، دردمند، رجوع کرنے والا ہے، اے ابراہیمؑ منہ پھیر لے اس بات سے تحقیق اب آیا ہے حکم پروردگار تیرے کا اور تحقیق وہ لوگ آنے والا ہے ان کو عذاب نہ پھیرا جاوے گا۔

سورہ عنکبوت میں ہے :

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۡ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

(آیات ۳۲/۳۱)

اور جب آئے بھیجے ہوئے ہمارے ابراہیمؑ کے پاس ساتھ بشارت کے کہا انہوں نے تحقیق ہم ہلاک کرنے والے ہیں اہل اس بستی کے کو، تحقیق رہنے والے اس کے ہیں ظالم، کہا تحقیق بیچ اس کے لوطؑ ہے کہا انہوں نے ہم خوب جانتے ہیں اس شخص کو کہ بیچ اس کے ہے البتہ نجات دیں گے ہم اس کو اور اہل اس کے کو مگر جورو اس کی کہ ہے بیچھے رہنے والوں سے۔

لیکن دوسروں کے حق میں اِس توسّع و ترحّم کا روادار ابراہیمؑ اپنے حق میں ترخّص کی کسی گنجائش سے بھی فائدہ اٹھانا نظر نہیں آتا۔ تا آنکہ عین اُس وقت بھی جبکہ نمرودیوں کی طرف سے تاریخ انسانی کی سب سے زیادہ ہولناک ترین سزا دینے کے لیے اُسے ایک لمبی مدت تک بھڑکائی جانے والی بے مثل آگ کے الاؤ میں ڈالے جانے کا بالکل آخری

مرحلہ درپیش تھا۔ اور بعض تاریخی و تفسیری روایات کے مطابق جبریل امین، خلیل اللہ علیہ السلام کی اِس نازک ترین حالت پر تڑپنے والی کائنات کا نمائندہ بن کر حاضرِ خدمت ہُوا اور " ھل لک حاجۃ " کی تعریض سے مدد کی پیش کش کی تو خُلتِ الٰہیہ میں سرشار اِس مُوحّد اعظم نے کسی تامّل اور ذہنی کش مکش کے بغیر " امّا الیک فلا " جیسے بلند آہنگ جواب سے اِس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت فرمائی اور اپنی شانِ خلیلی کو اس ہوشرُبا موقع پر بھی توجہ الی الغیر کے شائبے تک سے پاک صاف ثابت کیا۔

خلیل اللہ کا یہ جواب اِس حقیقت کی بھرپور غمّازی کرتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام حد درجہ مایوس کن حالات میں بھی کسی قسم کے جذباتی اِفراط یا بزدلانہ تفریط کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر حال میں ان کی باتیں " مَا یَخْرُجُ منہ الا حق [1] " کے بمصداق واقعیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اِس جملے کی ساخت و پرداخت کا بغور مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انتہائی لطیف پیرائے میں اپنی خلقی ضعف و ضرورت کا اظہار بھی ہے کہ " اللّٰہ الصمد " کے بغیر وجود و ہستی کا کونسا فرد ہے جو فقر و احتیاج سے مبرّا ہو اور مومنانہ مقام و مرتبے کا بیان بھی، کہ اخلاص و احسان کی ذائقہ شناسی کے بعد سمیع و بصیر اور رحیم و کریم مالک و خالق کو چھوڑ کر بے بسی و بے چارگی میں ڈوبی ہوئی مخلوق سے استمداد و استعانت زیبا کب ہے۔

---

[1] امام ابو داؤد اپنی سنن اور امام حاکم مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی علیہ السلام سے جو کچھ سُنتا اُسے لکھ لیتا تھا تو قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ کیا تم نبی علیہ السلام سے جو کچھ بھی سُن لیتے ہو اُسے لکھ لیتے ہو۔ حالانکہ نبی علیہ السلام بھی انسان ہیں خوشی اور غصّے دونوں حالتوں میں باتیں فرماتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ غصّے کی حالت کی بعض باتیں ناگفتنی بھی ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ میں لکھنے سے رُک گیا اور پھر کسی موقع پر نبی علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے اپنی اُنگلی سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے " ما یخرج منہ الا حق " یعنی اس منہ سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔

بسلسلہ "رسول اللہؐ اور آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین کا اندازِ فکر"

مغربی ایمپائر کا قیام

(محترم عبدالقادر جیلانی کے مقالے کی تیسری قسط)

مغرب کی علیحدگی

مغربی سلطنت روما کے اختتام کے بعد مغرب حسب ذیل چھ خود مختار سلطنتوں میں بٹ گیا[1]

۱۔ برطانیہ	اینگلو سیکسن سلطنت
۲۔ شمالی گال	فرینک سلطنت
۳۔ پراونس	برگنڈی سلطنت
۴۔ اکوتانیہ اور اسپین	ویزی گوتھ سلطنت
۵۔ افریقہ اور جزائر بحر روم	وینڈال سلطنت
۶۔ اطالیہ	آسٹرو گوتھ سلطنت

یہ ساری کی ساری جرمن سلطنتیں تھیں۔ ان میں سے کسی سلطنت کے حکمراں نے نہ تو اپنی شہنشاہیت کا دعویٰ کیا اور نہ ہی بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار اعلیٰ سے تعارض۔ روم کا پوپ اب بھی شہنشاہ بازنطین کو مغرب کا آئینی شہنشاہ تصور کرتا تھا۔ کلیسا کی دستاویزات پر شہنشاہ بازنطین کے سن جلوس کی تاریخ درج ہوتی تاہم عملاً مغرب کا کوئی شہنشاہ نہ تھا۔

بازنطینی شہنشاہ جسٹینین (Gustinian) نے اپنے عہد (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) میں مغربی سلطنت کے علاقوں کی بازیابی کا فیصلہ کیا۔ ۵۳۰ء سے ۵۵۳ء تک بازنطینی افواج نے ایسے تمام علاقے فتح کر لئے جو بحر روم سے متصل تھے تاہم اسے فرینک سلطنت اور اینگلو سیکسن سلطنت فتح کرنے کا موقع نہ مل سکا ——

1 Henry Pirenne.—A History of Europe, P. 30

جسٹینین کے عہد سے مشرقی سلطنت روم کو بازنطین کہا جانے لگا تھا۔ گویا اس عہد کے بعد سلطنت روم (مغربی) بازنطین کا ایک ملحقہ علاقہ بن گئی۔ اس عہد سے قبل "روم" مشرقی علاقے پر حکومت کرتا تھا اور اب خود روم پر بازنطین کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ الحاق بھی عارضی ثابت ہوا۔ جسٹینین کی وفات کے بعد بازنطین امپائر پر روسی علاقے کی وحشی اقوام آوار (Avar) اور سلاف (Slav) نے دھاوا بول دیا۔ دوسری جانب ایشیا میں ایرانی ساسانیوں سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ مغرب پر فوج کشی نے بازنطین کو اس قدر زیر بار کر دیا تھا کہ خزانہ مزید جنگی اخراجات بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ ان حالات نے بازنطین کو مدافعتی جنگ پر مجبور کر دیا اور مغرب کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ بازنطین کی کمزوری سے فائدہ ایک نئے جرمن قبیلے "لومبارڈ" (Lombard) نے اٹھایا۔ اس قبیلے نے گوتھ قبائل کے نقش قدم پر ترک وطن کیا اور شمالی اطالیہ پر قبضہ کر کے لومبارڈ سلطنت قائم کر لی۔ اس نئی سلطنت کے قیام کی بدولت فرینک سلطنت بازنطین کی دسترس سے باہر ہو گئی۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر بازنطین مغربی علاقوں کی بازیابی میں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس درمیان ظہور اسلام نے بازنطین کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور مغرب نے اپنے آپ کو بازنطین سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر لیا۔

لومبارڈ اور فرینک ریاستوں کی پیروی کرتے ہوئے مغرب کے دیگر علاقوں نے بھی بازنطینی اقتدار کا جوا اتار پھینکا۔ اس طرح ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں اس سیاسی وحدت کا خاتمہ ہو گیا۔ جسے تاریخ "رومن امپائر" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

فاتحین مغرب اور کلیسا

جرمن فاتحین جنہوں نے مغربی رومن امپائر پر قبضہ کر لیا تھا، نیم وحشی تھے۔ انہیں تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مذہبًا بت پرست تھے دریائے ڈینیوب کے آس پاس کے کچھ قبائل اگرچہ عیسائیت قبول کر چکے تھے مگر وہ "رومن کیتھولک" کی بجائے "ایرین" (Arian) تھے۔ مغرب ایرین فرقے کو بدعتی تصور کرتا تھا اور بدعت مغرب

---

1. Henry Pirenne.--A History of Europe, P. 41

کی نظر میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔ جرمن فاتحین روم کی تہذیبی برتری کے قائل تھے اور انہوں نے تیزی کے ساتھ رومن تہذیب کو اپنانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ رومن یا لاطینی تہذیب میں رنگ گئے۔ جرمن طور طریقے رومن انداز معاشرت میں گم ہو گئے۔

جرمنوں نے نہ صرف طرز حکومت، اصول سیاست اور انتظام مملکت کو قبول کیا بلکہ کلیسائے روم کی کوششوں سے انہوں نے "رومن کیتھولک" مذہب بھی اختیار کر لیا۔ عیسائی ہونے کے بعد کیتھولک چرچ نے انہیں مغرب کے شہری تسلیم کر کے "عیسائی دولت مشترکہ" (Christian Commonwealth) کا رکن بنا دیا۔[1]

اس طرح یہ نیم وحشی جرمن جو بظاہر فاتح تھے حقیقی فاتح ثابت نہ ہو سکے۔ ان کی تہذیبی موت جلد ہی واقع ہو گئی۔ حقیقی فاتح رومن چرچ ثابت ہوا جس نے ان وحشیوں کو رام کر کے اپنا تابع فرمان بنا لیا۔[2]

مغرب میں کوئی شہنشاہ نہ تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار برائے نام تھا۔ رومن دور کے قانون ساز ادارے "سینٹ" کو جرمن فاتحین نے نابود کر دیا تھا، اب تمام اقتدار حکمراں کی ذات میں مجتمع ہو گیا۔ مغربی ریاستوں کے سارے حکمراں عیسائی ہو چکے تھے اور پوپ کو اپنا روحانی اقتدار اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ پوپ کے پاس اس کی اپنی سینٹ "کوریا" موجود تھی۔ قریہ قریہ گرجا گھر تھے۔ ہر گرجے کے پادری کا قریبی تعلق عوام سے تھا۔ مذہبی سربراہ کی حیثیت سے پوپ کا حکم بادشاہ پر بھی چلتا تھا۔ جبکہ پوپ بادشاہ کے حکم کا پابند نہ تھا۔ پوپ کا ادارۂ کلیسا مالی اعتبار سے خود کفیل تھا۔ انتظامی معاملات میں خود مختار۔ اس کے سارے کارکن تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے جبکہ حکمراں ان سہولتوں سے عاری۔ رومن سول ایڈمنسٹریشن تباہ ہو چکا تھا۔ جرمن اسے بحال نہ کر سکے۔ عملاً حکومت کا ہر شعبہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ فاتحین نے بے بسی کے عالم میں کلیسا کی طرف دیکھا۔

---

1. Henry Pirenne --A History of Europe, P. 32

2. Toynbee, A.G --A Study of History Vol. II. P. 320

ریاستی نظم و نسق پر چرچ کی بالادستی

کارولنجین (Carolingian) خاندان نے فرینک سلطنت کے نظم و نسق کی بحالی کے لئے کلیسا سے کارکن مستعار لئے اور ایسے تمام عہدے جہاں نوشت و خواند، فہم و فراست، حکمت اور فیصلے کی ضرورت تھی مجبوراً کلیسا کے حوالے کئے[1] کلیسا نے ان عہدوں کو قبول کر کے مغرب کی سیاست کو اپنے تابع کرنا شروع کر دیا۔

رومن کیتھولک چرچ رومن ایمپائر میں سات صدیاں گزار چکا تھا اس دوران اس نے انتظامی ڈھانچہ زبان (لاطینی)، رسم الخط، قانون، رسم و رواج غرضکہ سب کچھ رومن ایمپائر سے مستعار لیا اور یہ ساری قدریں رومن ایمپائر کے زوال کے بعد کلیسا نے محفوظ اور زندہ رکھیں۔ کارولنجین دور میں کلیسا نے ان تمام قدروں کو پھر سے حکومت کے لئے استعمال کر کے ان کا احیاء کیا۔ چونکہ نئے معاشرے کو یہ سب کلیسا کے توسط سے میسّر آئی تھیں اس لئے کرسچین قدریں کہلائیں حالانکہ ان میں سے کوئی بھی قدر کرسچین نہ تھی بلکہ سب کی سب من و عن رومن تھیں۔

کارولنجین عہد سے پیشتر چرچ، ریاست (State) کے تحت تھا شہنشاہ کا حکم چرچ کے معاملات میں بھی حرف آخر تھا جبکہ چرچ کو اسٹیٹ کے معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ اس عہد سے مغرب میں یہ کیفیت بالکل بدل گئی یہاں اسٹیٹ کو چرچ کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا جبکہ چرچ اسٹیٹ کے ہر شعبے میں دخیل اور بالادست تھا۔ اس اقتدار اور بالادستی سے مشرقی چرچ بازنطین میں قطعی محروم تھا۔ بازنطین شہنشاہ کے نزدیک پوپ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ دیگر اساقفہ کی طرح پوپ بھی شہر روم کا اسقف تھا جس کے تقرر اور تنزل کا اختیار شہنشاہ کو حاصل تھا۔

مغرب پر جیسے جیسے شہنشاہ بازنطین کی گرفت کمزور ہوتی گئی یورپ کا اختیار مستحکم ہوتا گیا پوپ نے شہنشاہ کی جگہ سنبھال لی۔ وہ مغرب کی عظیم ترین شخصیت بن گیا۔ وہی مغربی حکمرانوں کا رہنما تھا۔ اس کے دم سے مغرب کا نظم و نسق قائم تھا، وہی قانون ساز تھا۔ ضرورت کے وقت سیاسی مدبّر کی حیثیت سے معاہدات

1. Henry Pirenne.—' A History of Europe ', P. 57

کرتا اس کے توسط سے حکمرانوں کے قضیے طے ہوتے۔ حملہ آوروں سے شرائط صلح طے کرتا۔ علاقوں کی مدافعت کرتا۔ بادشاہوں کے تنازعات طے کرتا۔

بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کا خاتمہ

مغرب کے نئے معاشرے میں پوپ "نائب عیسیٰ" تھا جس کے تقدس کی نظیر روئے زمین پر میسر نہ تھی۔ مغرب کے عوام اور سب ہی پر اس کا حکم چلتا۔ ہر حکمران پوپ کی قدم بوسی کو اپنی سعادت تصور کرتا۔ ان حالات میں پوپ کے لئے یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار مغرب میں باقی رہنے دیتا۔ پوپ اگر بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کو باقی رہنے دیتا تو خود اس کا اقتدار مجروح ہوتا۔ چونکہ ابھی تک پوپ کے وسائل اتنے نہ تھے کہ شہنشاہ سے بغاوت کرکے اس کی دسترس سے محفوظ رہ سکتا لہٰذا پوپ کو موقع کی تلاش تھی اور یہ موقع بھی جلد مل گیا۔

قسطنطنیہ پر مسلمہ بن عبدالملک نے ۷۱۶ء میں حملہ کیا۔ دو سال شہر کے محاصرے کے بعد ۷۱۸ء میں مراجعت اختیار کی[1]۔ اس واقعہ نے بازنطینی شہنشاہ لیو سوم (Leo III) کے وقار کو عالم عیسائیت میں خاصا بلند کر دیا۔ اس نے نہ صرف فوجی اور ملکی معاملات میں اصلاحات کیں بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اصلاحات کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ چرچ کی قوتیں کم کر سکے اور عوام کو کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے[2]۔ چنانچہ ۷۲۶ء میں اس نے شبیہہ پرستی (Incanoclasm) کی ممانعت کرتے ہوئے حکم دیا کہ کلیساؤں کو ہر قسم کی تصاویر اور مجسموں سے پاک کیا جائے۔ شہنشاہ کے اس حکم نے پوپ کو چراغ پا کر دیا[3] اور اس نے شہنشاہ کو مردود و ملعون قرار دیا۔ پوپ کا یہ عمل آزمائشی تھا۔ اس سے قبل کسی کلیسا کے سربراہ نے شہنشاہ سے اس قسم کی گستاخی کی جرأت نہ کی تھی۔ شہنشاہ بازنطین

1. Bury, G.B.—'History of the Later Roman Empire' Vol II P. 405.
2. G. T. C. Fuller.—The Decisive Battles of the Western World, P. 241
3. Ibid, P. 242 and Also, Toynbee A.G. A Study of History, Vol. III, P. 276.
4. Ibid, P. 276 and Henry Pirenne s—A History of Europe, P. 65.

اس لیے عزتی کو برداشت کرنے پر مجبور تھا کیونکہ مغرب پر اس کا اقتدار برائے نام تھا۔ اطالیہ اس کے قبضے سے نکل کر لومبارڈ حکمرانوں کے زیر تسلط تھا۔ فرنیک حکمران اسپین کے مسلم حملوں کا مقابلہ فرانس میں کامیابی سے کر رہے تھے۔ شہنشاہ بازنطین کی بے بسی اور فرنیک حکمرانوں کی روز افزوں قوت پوپ کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوئی[1]۔

مغرب خود مختاری کی جانب

ابتدائی آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنا شروع کیا اس وقت فرنیک سلطنت پر جو خاندان حکمران تھا اسے میروونجین (Merovingian) گھرانا کہا جاتا ہے۔ ابتداءً یہ چھوٹی سی ریاست تھی مگر مسلم حملے کے وقت اس کی حدود اسپین سے لے کر ڈینیوب تک وسیع ہو چکی تھیں۔ فرنیک حکمران اطالیہ پر یلغار کر کے قدم بقدم، لومبارڈوں کو شکست دے رہے تھے لیکن مسلم حملوں نے ان کو جہاں تھے وہیں روک دیا آہستہ آہستہ ان پر زوال آتا گیا۔ میروونجین بادشاہ آخری دور میں بے دست و پا تھے۔ اصل قوت شاہی محل کے حاجب (Mayor of Palace) پپّن کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ شخص ایک نیم جرمن نیم رومن، گھرانے — کارولنجین ——— (CAROLINGIAN) سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی کے دور میں اس کے بیٹے چارلس مارٹل (Charles Martel) نے کئی جنگیں جیتیں۔ امیر عبدالرحمن الغافقی نے جب ۷۳۲ء میں اسپین سے فرانس میں پیش قدمی کی تو یہی چارلس ان سے "طورس" میں مدمقابل ہوا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اس جنگ کی فتح کا سہرا چارلس کے سر باندھا جبکہ امیر کی شکست مسلم قبائل کی اندرونی رقابت کا نتیجہ تھی[2]۔ اس مفروضہ فتح نے چارلس کو پورے ملک کا ہیرو اور آقا بنا دیا۔

چارلس کے بعد اس کا بیٹا پپّن دی شارٹ (Pippian the Short) ۷۴۱ء میں جانشین ہوا۔ اس نے ارباب کلیسا سے تعلقات پیدا کئے اور سینٹ بونی فیس (St Boniface) کے توسط سے پوپ تک رسائی حاصل کی، حالات ایسے

1. Toynbee, A.G. -A Study of History, Vol. II, P. 431.

2. Cesare Folingo Art.—'The Transmission of the Legacy in the Legacy of Rome, P. 14-15.

تھے کہ پین اور پوپ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ پین عملاً حکمران تھا جب کہ آئینی حکمراں میروونجین گھرانا تھا۔ اسے ایسے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اسے آئینی حکمراں کی حیثیت دے سکے۔ خود اتنی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ اپنی قوم کے قانونی تاجدار سے تاج چھین کر اپنے سر پر رکھ لے۔ اور پوپ میں یارا نہ تھا کہ قابل اطمینان دفاعی قوت کے بغیر شہنشاہ بازنطین کے اقتدار اعلیٰ سے منحرف ہو سکے۔ پین اس ہنگامے سے خوف زدہ تھا جو غاصبانہ تاج پوشی کے سبب قوم میں برپا ہوتا اور پوپ اس فوج سے لرزاں تھا جو شہنشاہ کے اقتدار سے تعارض کی صورت میں بازنطین سے اطالیہ پر نازل ہوتی۔ ہر دو کے مقاصد کی تکمیل ایک دوسرے سے ہوتی تھی اور دونوں ہی نے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

انتقال اقتدار جب راہ ہموار ہوگئی تو ۷۵۱ء میں پین نے پوپ کی خدمت میں ایک سفارت روانہ کی جس نے پوپ سے یہ درخواست کی کہ:-

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ القاب شاہی ایک ایسے شخص سے منسوب کئے جائیں جو حقیقی معنوں میں اقتدار کا حامل ہو اور عملاً اختیارات کو روبکار لاتا ہو نہ کہ ایسے شخص سے (منسوب رہیں) جو صرف نام کا بادشاہ ہو۔"[1]

اس درخواست پر پوپ نے نہایت ہمدردی سے غور کیا اور چند ہفتوں بعد پین نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے قانونی بادشاہ کو اپنے باقی ماندہ ایام ایک خانقاہ میں گزارنے کے لئے روانہ کر دیا۔ اس طرح پین یا کارولنجین گھرانے کو اقتدار منتقل کر کے پوپ نے مغرب کو بازنطینی حلقۂ اثر سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور مغرب کی ایک ایسی آزاد ریاست کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ جس کی تمام توانائیاں پوپ کی خدمت کے لئے وقف تھیں۔

ریاست کلیسا کا قیام پین نے پوپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اطالیہ کے لومبارڈ حکمرانوں پر فوج کشی کرے گا اور انھیں شکست دے کر کلیسا کی نذر وہ تمام علاقہ کرے گا جو مقدس شہر روم کے مضافات میں ہے۔ حسب وعدہ ۷۵۴ء میں

1. Henry Pirenne— A History of Europe, P. 77.

لومبارڈ سلطنت پر فوج کشی کی گئی اور انہیں شکست دے کر شہر روم اور اس کے مضافات کا علاقہ پوپ کو بطور نذرانہ پیش کیا گیا۔ اس علاقے پر مشتمل ایک ریاست قائم کی گئی جسے "چرچ اسٹیٹ" (Church State) کا نام دیا گیا۔[2]

قدیم رومن ایمپائر کا پایۂ تخت روم اب بلا شرکت غیرے، پوپ کا پایۂ تخت بن گیا۔ اس ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری بھی پیپن پر عائد ہوئی اور اسے اس ذمہ داری کا پابند کرنے کے لئے "نائب قیصر روم" (Patricius Romonorum) کا خطاب بخشا گیا۔

اقتدار اور تقدس مذہبی

پیپن کی تاج پوشی کے موقع پر جو مذہبی رسوم ادا کی گئیں ان کا وجود اس سے قبل نہیں پایا جاتا۔ اس مذہبی عنصر کی شمولیت نے بادشاہ کے اقتدار کو ایک مذہبی تقدس بخشا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ خدا اور اس کے نائب (پوپ) کا وفادار رہے گا۔ صلیب کو نشان سلطنت مقرر کیا گیا اور پیپن کو "شاہ بفضل رب" (Gratia Dei Rex or King by The Grace of God) کا خطاب عطا ہوا۔[1] اور حکومت عیسائی ضابطۂ اخلاق یعنی کلیسا کے حکم کی پابند ہوئی۔

یہ پابندی بعد کے حکمرانوں کو وراثت میں ملی اور اب مذہب ریاست کا لازمی جزو بن گیا۔ اب صرف عیسائی مغربی معاشرے کے رکن تھے۔ غیر عیسائی یا مذہب بدر (Excommunicated) افراد کی حیثیت باغیوں کی تھی۔ جن کی سرکوبی حکومت اور معاشرے کا فرض تھی۔

مغرب شہنشاہیت کی جانب

۷۲۶ء میں پوپ نے بازنطینی شہنشاہ کو مردود و ملعون قرار دے کر بازنطینی اقتدار کا مذاق اڑایا۔ ۲۵ سال بعد ۷۵۱ء میں کلیسا کی، کاسہ لیس حکومت قائم کر کے بازنطین کے متوازی ایک رقیب سلطنت کھڑی کر دی۔ تو اب اس کا مطمح نظر شہنشاہیت تھا۔ پیپن کے بعد اس کا بیٹا شارلمین تخت نشین ہوا۔ شارلمین اعظم کو جو شہرت میسر

---

2. Fuller J.F.C.—'The Decisive Battles of the Western World' P. 243.

1. Henry Pirenne 'A History of Europe', P 78.

آئی دہ اس سے قبل رومن ایمپرر، سیزر گویا اس کے بعد صرف نپولین کو ملی۔
شارلمین جب ۷۶۸ء میں تخت نشین ہوا تو مذہب معاشرے کی سب سے بڑی قدر بن چکا تھا۔ شارلمین کے عہد میں کلیسا کے احکامات کو ملکی قوانین کی حیثیت ملی۔ عیسائیت کو بزور شمشیر جرمن قوم سیکسن میں پھیلایا۔ رومن کیتھولک معاشرے کی حدود دریائے ڈینیوب تک وسیع کیں۔ ڈینیوب کے علاقے میں بسنے والی ایک قوم آوار (Avar) کا نام ونشان مٹا ڈالا۔ پھر سلاف (Slav) قوم کی طرف متوجہ ہوا۔ تو اسے بری طرح منتشر کیا اور اسکو کثرت سے گرفتار کیا کہ یورپ میں لفظ (Slave) کے معنی ہی غلام کے ہوگئے۔ اس نے جس علاقے میں بھی فتح حاصل کی وہاں بزور شمشیر لوگوں پر رومن عیسائیت مسلّط کی۔ ان لوگوں کے لئے جو عیسائیت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے موت کی سزا مقرر کی[1]۔

شارلمین نے مسلم اسپین پر بھی حملہ کیا۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد ناکامی کا داغ لے کر لوٹا۔ شارلمین کی تمام مہمات کلیسا کے مفاد میں تھیں خصوصًا لومبارڈ قوم پر حملے، اسپین کی مہم اور سیکس قوم کی تباہی میں صرف کلیسا کا مفاد کارفرما تھا۔ ان مہمات کے نتیجے میں پورا مغرب رومن کیتھولک چرچ کے حلقۂ اقتدار میں آگیا اور یہی خدمات تھیں جن کے باعث کلیسا نے شارلمین کو شہرت دوام بخشی۔ یہ شارلمین تھا جس نے مغرب کی سیاست کی باگ ڈور کلیسا کے ہاتھ میں دے دی[2]۔

شارلمین کی خدمات ملک اور مذہب کے لئے کچھ کم نہ تھیں۔ سونے پر سہاگہ اس نے پوپ کی ذات پر بھی ایک احسان کیا۔ اپریل ۷۹۹ء میں پوپ لیو سوم (LEO III) پر زنا کی تہمت لگائی گئی نیز دروغ گوئی اور دروغ حلفی کے الزامات بھی عائد کئے گئے[3]۔ پوپ نے فرار ہوکر شارلمین کے دربار میں پناہ لی۔ شارلمین نے اسے دوبارہ تعینات کرکے روم واپس کیا اس پر پوپ کے مخالفین مشتعل ہوگئے۔ چنانچہ ۸۰۰ء میں

---

1. TOYNBEE, A.J 'A STUDY OF HISTORY,' VOL II P.167
2. Henry Pirenne, 'A History of Europe, P 80. Also Shaw, B. 'Shaw on Religion' Edited by Warren Smiths, P. 141.
3. FULLER J.F.C. 'The Decisive Battles of Western World' P.245

شارلیمن اس قضیئے کو نمٹانے خود روم پہنچا اور معاملات رفع دفع کئے۔ ۸۰۰ء کرسمس کی عبادت میں شرکت کے لئے وہ سینٹ پیٹر کے گرجا گھر میں حاضر ہوا۔ ابھی وہ قربانگاہ پر دوزانو ہوا تھا کہ لیو نے قربان گاہ پر سے ایک تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نعرہ بلند کیا۔

Hail to Charles Augustus Crown of God, the Great and the Peace Bringing Emperor of the Romans.

تاج پوشی کے بعد لیو نے ان آداب شاہی کے ساتھ اس کی شہنشاہیت کا اعلان کیا جو صرف بازنطینی شہنشاہ کے لئے مختص تھے۔

اس طرح حضرت عیسٰی کا یوم پیدائش "ویسٹرن ایمپائر" کا یوم تاسیس بن گیا۔ چونکہ یہ مغربی شہنشاہیت سینٹ پیٹر کے مقدس جانشین کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی اس لئے اس کا نام "مقدس رومن سلطنت مغرب (Holy Roman Empire of the West) رکھا گیا[1]۔

اس طرح کلیسا نے مغرب کو سلطنت بازنطین سے علیحدہ کیا۔ مغربی معاشرے کی اپنی نگرانی میں نشوونما کی۔ اسے ایک شہنشاہیت کا درجہ دیا اور اسے رومن ایمپائر کا جانشین بنایا۔ یہ ایسی ایمپائر تھی جس کا شہنشاہ پوپ کی قدم بوسی کرنے میں فخر محسوس کرتا۔ جو کلیسا کی حفاظت اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے وقف تھی اور جس کی باگ ڈور پوپ کے ہاتھ میں تھی۔

مغرب کا معاشرہ

یہ معاشرہ مذہباً کیتھولک عیسائی تھا اور اس نے عیسائیت کو رومن دور میں قبول کیا تھا لیکن یہ عیسائیت خالص رومن عیسائیت تھی اور سرتاسر ہلینک اثرات کی

1. Fuller, J.F.C. The Decisive Battle of the Western World, P. 246.

2. Arnold, Sir Thomas. The Legacy of Islam, P. 41.

یہی تو میں جنہوں نے اپنی ملکی حدود سے باہر کی دنیا کو غلامی کا تحفہ دیا ، اور سب کے سب مغربی سوسائٹی کے ارکان ہیں - اس لوٹ میں یورپ کے کسی غیر مغربی معاشرے کیلئے کوئی گنجائش نہ پیدا ہونے دی -

مغرب اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کو عامی تہذیب اور عالمی تاریخ کا درجہ دیتا ہے، جو صرف خوش فہمی ہے - اگر وہ اپنی تہذیب و تاریخ کے سوا باقی تہذیبوں اور تاریخوں کو عالمی کہے تو اس میں ضرور وزن پایا جائے گا - کسی تہذیب کو دوسروں پر فوقیت دینا محض احساس برتری کا اظہار ہے ورنہ دنیا کی زندہ تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب ہے جو باعث افتخار نہیں - ہر تہذیب اعلیٰ اقدار ثقافتی خطوط کی حامل ہے - مشرقی آرٹ ، فلسفۂ چین ، فکر اسلام اور حکمت ہند سب نے اپنی تہذیبوں کے سر بلند مینار ہیں ، لیکن مغرب بیک جنبش قلم ان سب کو لغویت قرار دیتا ہے - یونانی معاشرے کا احترام بھی ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے حالانکہ مغرب کے لئے یونانی تہذیب عرصے تک سرمایۂ افتخار رہی ہے - مغرب اگر کسی غیر مغربی تہذیب کا ذکر کرتا ہے تو تمسخر کے ساتھ اور اگر اپنی تہذیب پر آنچ آتے دیکھتا ہے تو دنیا کی دوسری اقوام کو تباہ کرنے سے گریز نہیں کرتا - مغرب کی تمام اقوام ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں اگر ایک مشترک نام دیا جائے تو وہ "نارڈک مین" (Nordic Man) کہے جا سکتے ہیں -

نارڈک لوگ شمالی یورپ کے اصل باشندے تھے - بھورے بال اور نیلی آنکھیں - زمانہ ماقبل تاریخ سے یہ لوگ اپنے نارڈک علاقے سے منتقل ہو ہو کر جنوب کی طرف آتے رہے - انہوں نے بحر روم کی کمزور اقوام پر اپنی حکومت قائم کی قدیم رومی، قدیم یونانی، جرمن، فرنیک سب کے سب نارڈک تھے - جسمانی ساخت اور زبان کے اعتبار سے ہندوستانی آریوں سے مشابہہ ہیں اس لئے انہیں "ہند اور یائی" (Indo Europian) کہا گیا ہے -

چونکہ ہند اور یائی نژادوں نے فاتحین کی حیثیت سے مشرق و مغرب ہر طرف ساری دنیا کو زیر نگیں کیا تھا اس کی حکمرانی کی - یہی وہ نسل تھی جس نے زرتشت ،

A J Toynbee A study of History P 156 Vol. I 7th Edn England 1956

مہاتما گوتم بدھ، سقراط، افلاطون، ارسطو جیسے مفکر پیدا کئے۔ سکندر، دارا، سیزر اور آگسٹس جیسے فاتحین اس میں گزرے، اسی نے سیاسی عظمت روما کی تشکیل کی۔ اسی نسل کے طفیل دنیا نے تہذیب اور ثقافت کی ... یہ نسل باقی نوع انسانی سے افضل سمجھی جاتی تھی ... یورپ کو اتفاق تھا لیکن جب قومیت کے جذبے نے جنم لیا تو مختلف اقوام ... خصوصاً جرمنوں نے شدت کے ساتھ اس میں ... پیدا کی ... "آرڈو جرمانک" اصطلاح ... کے بعد دیگر ایسے ... پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس نظریے کی دیوانگی میں اضافہ کیا اور بالآخر پورا مغربی معاشرہ ... احساس برتری کا شکار ہو گیا۔

ہاؤسٹن اسٹوارٹ چیمبرلین (Houston Stewart Chamberlain) نے ... کی فطری قوت ... عظیم تہذیب، ہر عظیم شخصیت اور ہر عظیم کارنامہ کو نارڈک نسل سے منسوب کر ڈالا۔ وہ صرف شارلیمین اور ڈانٹے کو نارڈک بنانے پر مطمئن نہ ہو سکا بلکہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بھی اس میں شریک کر کے دم لیا[1]۔ غرضیکہ نارڈک میں یہ نظریہ ایسا پارس تھا جو ہر سفید آدمی کو کندن کر دیتا ہے۔

نسلی برتری کا یہ تصور مغرب کی دیگر سفید فام اقوام پر کوئی خصوصی برتری نہ دیتا تھا۔ اس نے انسان کو سفید فام اور رنگدار گروہوں میں تقسیم کر دیا اور تقسیم کا یہ نظریہ وسط انیسویں صدی میں عام ہوا۔ پندرہویں صدی تک مغرب میں انسان کی تقسیم ایک دوسرے انداز سے کی جاتی تھی۔ یہ تقسیم اہل دین اور بے دین کی تھی۔ (Christians and Heathen) قدیم تقسیم جدید کے مقابلے میں قدرے بہتر تھی کہ اس میں دیگر مذاہب کو عیسائی ہونے کے طفیل کچھ نہ کچھ مساوات میسر تھی۔ مغرب میں تقسیم کی یہ شرائط دو تین ہو گئیں۔ نسلی تفاخر نے کردار، اخلاق اور مذہب کی قید اٹھا کر صرف رنگ کو معیار برتری بنا دیا۔ کیتھولک عیسائی کی قدیم شرط نے مغرب کو دیگر قوموں پر اپنی برتری جتانے کا موقع دیا۔ قدیم عیسائیت کی نظر میں عالم عیسائیت کے سوا باقی دنیا بے دین اور گمراہ تھی مگر ایسی نہ تھی جو راہ راست پر نہ لائی جا سکے۔ ایسی

---

1. Toynbee A. J. A Study of History, P. ...
London 1956

اچھوت نہ تھی جسے پوتر نہ کیا جا سکے۔ ان اچھوتوں کو اوپر لانے کی امید اور نہ توقع تھی لیکن نسل تفاخر نے بقیہ دُنیا کو اچھوت سے بدتر کر دیا۔ تاہم اس تفاخر میں فرانس وہ واحد ملک اور قوم ہے جس نے دیگر مغربی ممالک کا ساتھ نہ دیا وہاں معیار تفاخر رنگ نسل و مذہب کی بجائے صفات انسانی کو تسلیم کیا گیا۔ وہاں انسانیت کی تقسیم صاحبِ صفات اور محروم صفات کے دو گروہوں میں کی جاتی ہے[1]۔

رنگ صرف نارڈک مین کا معیار ہے جو اسے دُنیا کے دیگر انسانوں سے ممیز کرتا ہے ورنہ دیگر ممالک میں رنگ معیار مفاخرت نہیں۔ ہندوستان میں ذات پات معیار مفاخرت ہے۔ برہمن اور چھتری چاہے جس رنگ کے ہوں، ممتاز ہیں۔ جاپان میں لوگوں کے رنگ زرد، سُرخ، سفید ہر طرح کے ہیں مگر وہاں بھی رنگ معیار مفاخرت نہیں نیز نسل بھی عالمی معیار افتخار نہیں یہ معیار بھی بدلتا جاتا ہے۔ چین اور جاپان میں نسلی نجابت کا معیار جسمانی بال ہیں۔ جس کے جسم پر جس قدر کم بال ہیں وہ اتنا ہی نجیب متصور ہوتا ہے۔ بالوں کی زیادتی کمتر نسل کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک معیار تمیز انسانی جسم کی بو ہے۔ دور وحشت میں انسانی جسم سے شیر اور چیتوں جیسی بدبو آیا کرتی تھی اس قسم کی بدبو کا ہونا بھی دور وحشت سے قربت کی دلیل ہے۔ مغربی افراد کے جسم کی بو غیر مغربی بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے جبکہ مغربی فرد خود بمشکل محسوس کر سکتا ہے۔

غرضکہ مغرب کی نسل پرستی میں جو بھونڈی سنگدلانہ اور سستی خود پرستی پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل کسی تہذیب میں نہیں پائی گئی اور عصر حاضر نے اس کی معرفت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی مذمت شروع کر دی ہے یونانیوں کو بھی اس کا سہارا لینا پڑا تھا لیکن ان کے فلسفۂ نسلی برتری میں عقلیت، اخلاق، مروت اور [illegible] کی شان بھی پائی جاتی ہے۔

رنگ و نسل کے امتیاز کے ساتھ مغرب کو روم سے ایک عقیدۂ دوام بھی ملا رومن دُنیا اپنی تہذیب اپنے ملک اور قوم نیز مذہب کو لافانی تصور کرتی تھی۔

---

1. Taylor Griffith 'Environment and Race. P 33 - Oxford University Press 1927

قدیم شعراء مثلاً تبلس (Tibullus 54 - 18 BC) لافانی شہر روم
کے قصیدے پڑھتے چلے آئے ہیں۔ جیسے ورجل نے کہا ہے۔

وہ میں تجھے سلطنت ... عطا کرتا ہوں۔[1]

(I give you The Empire without End)

لیوی نے اسی یقین کے ساتھ روم کو ابدی شہر لکھا[2]
(The City Founded for Eternity) اس معاملے میں مسیحی اہل فکر
بھی بت پرستوں سے پیچھے نہ تھے۔ وہ بھی روما کو لافانی تصور کرتے تھے۔ جب ۴۱۰ء
میں روم کو شکست فاش ہوئی تو عیسائیت کے لئے یہ لمحہ نہایت ہی اندوہ ناک تھا۔ اس
شکست کی ذمہ داری بت پرستوں نے دین مسیحی پر ڈالی اور کلیسا نے اپنا پورا زور
قلم اس کی تردید میں صرف کر دیا۔ سینٹ آگسٹائن نے مشہور کتاب "سٹی آف گاڈ"
(City of God) تحریر کی جس میں روم کے سقوط کی یہ توضیح کی روم کا مشرک
دور ختم ہو گیا اور اب ایمان کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اسے مسیحی شہر ہونے کا جو
اعزاز میسر آیا ہے وہ ابد تک قائم رہے گا۔ یہی وہ مفکر تھا جس نے آسمانی بادشاہت
کی تاویل چرچ سے کی۔ گویا رومن امپائر کی جگہ چرچ نے لے کر انجیل کی آسمانی بادشاہت
قائم کر دی۔ اسی عقیدۂ دوام کا یہ اثر تھا کہ مغرب کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ سلطنت روما
کے کھوئے ہوئے علاقوں کو از سر نو عالم عیسائیت میں شریک کیا جائے۔[3] جنگ
صلیبی، ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج، مسلم ممالک پر حملے اور اس صدی میں ترکی
پر یورش، سب ہی واقعات اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔

مغرب کے احساس برتری کے عناصر میں ایک عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا۔ سلطنت
روما کے انہدام کے بعد نشاۃ ثانیہ تک مغرب کی اہم ترین قدر مذہب تھی۔ اس دور
میں پورا مغرب چرچ کی گرفت میں تھا۔ مغرب پر شمال وحشی قبائل کی یلغار عہد وسطیٰ
میں مسلسل جاری رہی لیکن ان سب کو چرچ بتدریج عیسائیت میں جذب کرتا رہا۔

---

1 — 2, Cited by Toynbee A. J. In a Study of HistoryP. 4 Vol. IV

3. Nick Earl 'Culture and Creed London 1967

4 Grunebaum G E 'Medieval Islam . P. 62 - 2nd Edn. Chicago. 1953

عیسائیت قبول کرنے کے بعد ان حملہ آوروں کو مغربی عیسائی دنیا کا شہری تسلیم کر لیا جاتا۔ گویا نسل، وطن اور قومیت کا یہاں کوئی وجود نہ تھا۔ یہ سب عناصر مذہب کے آگے بے معنی تھے۔ صرف عیسائیت ہی وہ معیار تھی جس کی بنا پر مغرب کی شہریت میسر ہو سکتی تھی۔ مغرب میں عیسائیت کے قیام اور دیگر مذاہب کو ختم کرنے کی منظم کوشش کی گئی۔ رومن عہد میں جبری تبدیلی مذہب کا لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ بت پرستی کو چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین نے قانوناً ممنوع قرار دیا ۳۱۵ء میں تھیوڈوسس نے پورے مغرب میں ہر قسم کے مشرکانہ مذاہب پر پابندی لگائی تھیوڈوسس ثانی نے غیر عیسائیوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ لیو نے قانون کا پیشہ غیر عیسائیوں کے لئے ممنوع قرار دیا۔ جسٹینین نے تعلیم کے عہدے صرف عیسائیوں کے لئے مختص کئے اور اس نے اخر ش ۵۲۹ء میں حکم جاری کیا کہ ہر مشرک یا تو بپتسمہ لے ورنہ اس کا مال و متاع ضبط کر کے اسے ملک بدر کیا جائے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں پوپ گریگوری نے اطالیہ اور سسلی میں کچھ غیر عیسائی اقلیتیں پائیں جو گورنروں کو اپنی مذہبی آزادی قائم رکھنے کے لئے باقاعدہ سالانہ جزیہ پیش کرتی تھیں[1] جسے مغربی مؤرخین (Douccuy) کا نام دیتے ہیں

رومن عہد کے بعد مغربی عہد میں اس جبری تبدیلی مذہب میں مزید شدت نظر آتی ہے۔ شارلیمن کے عہد میں غیر عیسائی کے لئے صرف دو ہی صورتیں تھیں۔ عیسائیت یا موت[2]۔ اس جبری تبدیلی میں صرف حکومت ملوث نہ تھی بلکہ کلیسا بھی برابر کا شریک تھا اسی کے ایما پر حکومتوں نے یہ اقدامات کئے۔ پوپ گریگوری اوّل نے غیر عیسائیوں کو جنگ کے ذریعے عیسائی بنانے کی تحریک چلائی[3]

چرچ کے دور اقتدار میں کسی فرد کے لئے عیسائیت سے انکار یا بپتسمہ لینے کے بعد قانوناً کلیسا سے گریز ممکن نہ تھا ایسا کرنا نہ صرف کلیسا بلکہ حکومت اور معاشرے سے بغاوت کے مترادف تھا۔ کلیسا سے سرکشی کا نام بدعت تھا اور بدعت اس دور

---

1. Jones A.H.M. 'The Decline of The Ancient World P - 323.
2. Ibid - P 322
3. K. E. Grunebaum 'Islam' P - 129 Oxford 1969

کا سب سے بڑا جرم - بدعت کا احاطہ نہایت ہی وسیع تھا اس کا اطلاق مذہب فکر، رسم و رواج ، علم و عمل ہر شے پر تھا -

بدعت کے نام پر مغرب نے انسانی معاشرے پر جو مظالم کئے ہیں وہ عدم رواداری کی بدترین مثال ہیں - سیکسن قوم کا قتل عام صرف اس سبب سے ہوا کہ وہ عیسائی نہ تھے - حروب صلیبی دو سو سال تک لڑی گئیں جن میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں - انا بپٹسٹ (Anabaptists) فرقے کا قتل عام - پروٹسٹنٹ فرقے کا قتل عام فرانس میں سینٹ بارتھولومیو (Saint Bartholomew) کا قتل عام - پھر چالیس سالہ خوں ریزی جو فرانس میں فرانسس اوّل کے عہد سے ہنری چہارم کے عہد تک ہوئی - اس پر مذہبی داروگیر کے نام پر صدیوں لوگوں کو کلیسا کی عدالت نے قانون بدعت کی آڑ میں موت کے گھاٹ اتارا - بیس سال پوپ کے خلاف پوپ کے نزاع کے نتیجے میں خون ریزی - نئی دنیا میں صلیب کے سائے تلے ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کا قتل عام - اسپین میں ایک ایسی قوم کا قتل عام جو وہاں آٹھ سو سال سے بس رہی تھی جس نے ملک کی حالت بدل دی تھی اور جو عہد حاضر کی اوّلین معمار تھی - اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ عیسائی نہ تھی -

جرمنی میں کسانوں کا قتل عام اور البی جنسس (Albigenses) یا کتھارس (Cathars) فرقے کا قتل عام ، غرضکہ مذہب میں جبر و قوت کا استعمال عام و طیرہ رہا ہے - پانچویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک عیسائیت کے عقائد کی ترویج اور حفاظت دونوں کے لئے قوت و جبر کا بے دریغ استعمال کیا گیا یہاں تک کہ مغرب میں سوائے رومن کیتھولک کوئی دوسرا عقیدہ باقی نہ رہ گیا - مغرب میں مذہبی رواداری کے عدم وجود کو اس دور کے بیشتر اصحاب قلم تسلیم کرتے ہیں[1] وہاں کسی غیر کیتھولک اقلیت کا وجود نہیں پایا جاتا - اسپین کی تباہی اس عدم رواداری کی داستان ہے -

مغرب کی خودستائی صرف تاریخ ، معاشرت و تمدّن کے شعبوں تک محدود نہیں

---

1 - J. B. Trend, Art, 'Spain, Portugal, In the Legacy of Islam, P - 4. Oxford University Press 1960.

بلکہ اس سے مذہب بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کی نظر میں رومن کیتھولک ہی حقیقت عظمیٰ کا حامل ہے۔ مغرب سے باہر کے تمام مذاہب حقانیت سے بیگانہ، باطل اور چربہ ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں مذہب کا شرارہ ایشیا کی سرزمین فلسطین سے ملا ہے۔ اسے بھی نہ صرف اپنی ہی تہذیب کا جزو تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وہ حقیقت جو ان کے دعوے کے منافی ہو اسے جھٹلاتے اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ نہ معلوم کیا مجبوری تھی کہ مغرب نے عہد نامہ قدیم کو بھی اپنی دینی کتاب تسلیم کیا ورنہ عہد نامۂ قدیم تو پورا کا پورا شامی عنصر ہے۔ اس کا ہر کردار، ہر مقام اور ہر ماحول شامی ہے۔ اس کے تصورات، تعلیم اور اخلاق سب ہی کچھ غیر مغربی ہے۔

حیرت ہے کہ مغرب نے اپنی کوئی "گاسپل" مدوّن نہ کی۔ مغرب کے مروجہ کیتھولک مذہب اور عیسائی مذہب میں کس قدر بعد ہے اس کا اندازہ اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب صرف اپنے مذہب کو عیسائیت تصور کرتا ہے اور دنیا کے دیگر عیسائیوں مثلاً نسطوری، مونوفزائٹ (Monophysits) اور آرتھوڈکس کرسچین کو وہ بدعتی تصور کرتا ہے۔

پس نسل و رنگ کے ساتھ رومن کیتھولک ہونا ایک امتیاز ہے۔ دور جدید میں ان سب سے بڑی جو ایک اور قدر سرمایہ داری نظام نے پیدا کی وہ قومیت ہے۔ قومیت نے عالم عیسائیت کو قومی خطوں میں بانٹ دیا۔ اب "کرسچین کامن ویلتھ" نام کی کوئی شے نہیں رہ گئی ہے۔ قومیت کا تصور حالیہ ہے جو ایک ہی نسل، ایک ہی رنگ اور ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں تفریق پیدا کر کے انہیں علاقائی وحدت بنا دیتا ہے۔ اس قومیت نے نہ صرف خطے، زبان اور آبادی کو ایک دوسرے سے جدا کیا بلکہ کلیسا کو بھی تقسیم کر کے چرچوں کی بنا ڈالی جس کے سبب مغرب کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور جنگ برادر کشی کے دور میں داخل ہو گیا۔

متذکرہ بالا اقسام کی احساس برتری کے سبب مغرب کی نظر میں دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی احترام نہیں پایا جاتا۔ دیگر اقوام کو کمتر قرار دینے کی حسب ذیل چار وجوہ مقرر کی ہیں[1]۔

---

1. TOYNBEE. 'A Study of History' P. 226, Vol. VI

۱ - بت پرست (Heathen)

۲ - غیر مہذب (Barbarian)

۳ - مقامی (Native)

۴ - کم نسل (Racial Inferior)

اور ان چاروں کی آڑ لے کر وہ دُنیا کی ہر قوم کو کسی نہ کسی طرح کم تر قرار دے لیتی ہے ان کے انسانی حقوق کا انکار کرنے سے انسانیت کی تمام اقدار مجروح ہوتی ہے غرضکہ مغربی خصوصیات میں رنگ و نسل کا امتیاز۔ مغربی وطنیت اور دیگر مذاہب کو برداشت نہ کرنا شدت کے ساتھ واضح ہیں۔ دور وسطیٰ میں چرچ کی بالادستی کے تحت ہر قدر سے زیادہ اہم مذہب تھا۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا مقصد صرف مذہب کے تقاضوں کی تکمیل تھی۔ ریاست کی تعریف اس دور میں یہ تھی کہ حقیقی ریاست وہ ہے جہاں سچے مذہب کی تعلیم دی جاتی ہو اور عقائد کی حفاظت ہوتی ہو

> The Christian Fathers and with special forcefulness augustine, insisted that a just State is one in which the True Religion is taught i.e., Since the Advent of Christianity only A Christian State can be just, The Chief purpose of the Government of this State must be contributing to Human Salvation by preserving The Purity of Faith.

اس طرح فرد ریاست اور حکومت سب ہی صرف مذہب کے لئے وقف تھے اور مذہب سے مراد آفاقی حقائق نہ تھے بلکہ رومن کیتھولک عقیدہ تھا۔ مغرب اپنے مذہب کو سارے ادیان عالم سے برتر تصوّر کرتا تھا۔ صرف ان ہی کا مذہب حق تھا اور اس کے سوا سب باطل۔ صرف اسی میں رُوحانیت تھی جس کا شائبہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا۔ صرف رومن کیتھولک ہی مذہب نجات تھا جو رُوحانی تزکیہ کرتا اور یہ خصوصیت کسی اور مذہب یہاں تک کہ کسی اور کلیسا میں بھی نہ پائی جاتی تھی۔ مغرب سے باہر کی دُنیا غیر متمدن اور وحشی تھی جس کی کوئی قدر قابل احترام نہ تھی۔

مغرب صرف ایک علاقہ اور معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے اس کی تعمیر میں ماضی کی کئی تہذیبوں نے حصّہ لیا۔ یہودی تہذیب سے مذہب مستعار لیا۔ یونانی

(باقی صفحہ پر)

1. G.E. Grunebaum. Islam' P. 130, Oxford University - Press, 1969.

سیرت وسوانح

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور ادب عربی

نصرت علی اثیر

آپ ایک جید عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم ادیب اور شاعر بھی تھے۔ آپ نے مختلف علوم پر کئی ایک کتب تصنیف کیں۔ جن کو عربی ادب میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، زہد، جہاد اور اخلاق آپ کے نمایاں موضوع تھے۔ حدیث میں "اربعین" نویسی کا آغاز آپ نے ہی کیا۔

محمد بن جعفر الکتانی لکھتے ہیں: [1]

والاربعون لعبداللہ بن المبارک الحنظلی، وھو اول من صنّف فی الاربعینات۔

اسی طرح جہاد پر بھی آپ نے ہی سب سے پہلے تصنیف کی۔

کتانی لکھتے ہیں۔ [2]

والجھاد لابی عبدالرحمٰن عبداللہ بن المبارک بن واضح ... من تابع التابعین، الحافظ احد الاعلام المتوفی بھیت وھی مدینۃ علی الفرات سنۃ احدی واثنتین وثمانین ومأتہ، وھو اول من صنف فی الجھاد۔

عربی ادب میں یہ کتب گراں قدر اضافہ تھیں۔ اس کے علاوہ آپ نے عربی شاعری میں زہد، جہاد، شخصیات، اخلاق حسنہ اور علم کی فضیلت پر مختلف انداز میں اعلیٰ قسم کے شعروں کا اضافہ کیا۔ آپ کی شاعری دعوت وتعمیر سے عبارت تھی۔ آپ نے تنقید وتوصیف

---

[1] محمد بن جعفر الکتانی، الرسالۃ المستطرفۃ: ۸۲: مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء

[2] ایضاً ص ۴۲

دعوت وردا اور تعلیم و ترغیب کو بڑے نرالے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ آپ کے یہ شعر عربی ادب سے متعلق احباب کے لئے ایک انمول خزانہ ہیں۔

نثری خدمات :۔

کتابیں تو آپ نے کافی لکھیں جیسا کہ ابن سعد لکھتے ہیں۔

فروی روایۃ کثیرۃ وصنف کتبا کثیرۃ فی ابواب العلم وصنوفہ حملھا عنہ قوم وکتبھا الناس عنھم۔ [1]

یعنی کثرت سے روایت کی اور علمی موضوعات پر کافی تعداد میں کتابیں لکھیں ایک قوم نے آپ سے ان کتابوں کو روایت کیا اور اس قوم سے کثیر تعداد میں لوگوں نے لکھا۔ کثرت تعداد کے علاوہ ابن سعد کے اس قول سے کتب کی کی گراں قدری اور مانگ بھی عیاں ہوتی ہے۔

آپ کی ان متعدد تصانیف میں سے صرف چند کا تذکرہ مختلف جگہوں میں ملتا ہے جن میں سے بعض کے مخطوطے اب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم کے ہاں پہنچ چکے ہیں باقی کتب کے مخطوطوں کے بارے ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مذکورہ تصانیف کے بارے میں مختصر تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے۔

۱۔ تفسیر القرآن :۔

یہ تفسیر مخطوطہ کی صورت تک ہی رہی لیکن یہ مخطوطہ ابھی تک مفقود ہے۔ اور یہ بھی کہیں سے نہیں مل سکا کہ یہ کتاب کس دور تک کس روایت میں کہاں اور کس کے ہاں پہنچ پائی۔ صرف تفسیر ہی تصنیف کا نام کی حد تک کا تذکرہ اسمٰعیل باشا بغدادی نے ہدیۃ العارفین میں اور ابن ندیم نے الفہرست میں کیا ہے۔

۲۔ اربعین :۔

تذکروں سے اس حد تک پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک حدیث کی کتاب ہے جس کو سب سے پہلے اربعین کی صورت میں آپ نے ہی متعارف کرایا۔ اس کا وجود بھی مختلف تذکروں سے

---

[1] ابن سعد : طبقات الکبریٰ : ۷ : ۲۷۲ : مطبوعہ بیروت ۱۳۷۷ھ

صرف نام کی حد تک ملتا ہے۔ کسی روایت یا مخطوطہ کا کہیں سے بھی ذکر نہیں ملتا۔ اسمٰعیل پاشا بغدادی نے ہدیۃ العارفین میں اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ کتاب السُنن فی الفقہ:۔

اس کا ذکر بھی نام کی حد تک ملتا ہے۔ مندرجات کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہدیۃ العارفین اور الفہرست میں اس کا ذکر آیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ احادیث کی ایک فقہی ترتیب ہے۔ اس قسم کی ترتیب پہلے مروج نہیں تھی۔ بلکہ معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

۴۔ رقاع الفتاوی:۔

یہ کتاب بھی اپنے وجود اور مندرجات کے اعتبار سے مفقود الحال ہے۔ اس کا ذکر ہدیۃ العارفین اور کشف الظنون میں کیا گیا ہے۔ کشف الظنون کی عبارت سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اس کا نام الرقاق بھی ہے۔ کشف الظنون کی عبارت ہے "رقاع الفتاوی۔ الرقاق لعبد اللہ بن المبارک الحنظلی المروزی المتوفی ۱۸۱ھ" اس عبارت کے لکھنے کے بعد اسی صفحہ ۱۱۹ پر پھر آگے "الرقاق۔ لعبد اللہ بن المبارک" کے نام سے علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔ ابو بکر محمد بن عمر بن خلیفہ الاموی نے اپنی کتاب "فہرست ما رواہ عن شیوخہ" میں حضرت عبد اللہ بن مبارک کی "کتاب الرقائق" نامی کتاب کا سلسلہ روایت ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ وجود اور حال کے اعتبار سے نامعلوم ہیں۔ اس لئے حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کیا یہ تین علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں۔ (۱)۔ رقاع الفتاوی (۲)۔ الرقاق (۳) کتاب الرقائق یا ایک ہی کتاب کے مختلف نام ہیں۔ یا رقاع الفتاوی کے مختلف معروف ابواب ہیں جن کو علیحدہ کتابی صورت دی گئی ہے۔

۵۔ الدقائق فی الرقائق

اس کتاب کا ذکر ہدیۃ العارفین میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ رقاع الفتاوی کا بھی علیحدہ کتاب کے طور پر ہدیۃ العارفین میں ذکر ہے۔ اس لئے نظر یہی آتا ہے کہ یہ رقاع الفتاوی سے علیحدہ کتاب ہے۔ باقی رہا مسئلہ الرقاق کے ساتھ اس کو

مناسبت کا، تو اس میں شبہ والی بات ہے۔ الرقاق کا ذکر صرف کشف الظنون میں کیا گیا ہے۔ اور محمد بن عمر ابن خلیفہ الاموی نے کتاب الرقائق کے نام سے کتاب کا سلسلۂ روایت ذکر کیا ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ کتاب الرقائق اور الرقاق ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں اور الرقائق فی الرقائق اس کی تلخیص یا تشریحی شکل ہے ——— چونکہ وجود اور حال کے اعتبار سے یہ سب مفقود ہیں اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بذاتِ خود ایک علیحدہ کتاب ہو۔ گمان ہر دو طرح سے کیا جا سکتا ہے لیکن حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔

۶۔ کتاب الزھد والرقائق

حضرت عبداللہ بن مبارک ایک عالم، عابد، محدث، مفسر، مورخ، شاعر اور تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے زاہد تھے۔ تذکروں میں آپ کو اجلاّ زھاد میں شمار کیا گیا ہے۔ زہد سے آپ کی یہ نسبت آپ کی اس کتاب سے جھلکتی ہے۔ کتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔

"والزھد لعبداللہ بن المبارک، وھو مرتب علی الابواب فیہ احادیث واھیہ"

یعنی زہد پر عبداللہ بن مبارک کی کتاب ہے جس کو مختلف ابواب میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں بعض واہیہ قسم کی احادیث ہیں۔

اس کتاب کا ذکر بروکلمان کی تاریخ ادب العربی میں، کتانی کے الرسالہ المستطرفہ میں، اسمٰعیل پاشا بغدادی کی ہدیۃ العارفین میں، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور اور ابن ندیم کی الفہرست میں ملتا ہے۔ یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں جامع قرویین کے کتبخانہ اور المانیا میں لائبزگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ۱۹۶۶ء میں حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ مائیکاؤن (ہندوستان) سے زیور طباعت سے آراستہ ہونے کے بعد اب اہل علم و دانش کے پاس پہنچ چکا ہے۔ لائبزگ کے کتب خانہ میں اس کے مخطوطے کا نمبر ۲۹۶/۲ ہے۔

کتاب الجہاد

حضرت عبداللہ بن مبارک ایک مجاہد تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کو جہاد سے والہانہ

لہ یہ وہ روایت ہے جن کی سند پر اعتماد نہ کیا جا سکتا ہو۔

حضرت فضیل بن عیاض عابد الحرمین کو جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا　　لعلمت انك فی العبادة تلعب
او کان یتعب خیله فی باطل　　فخیولنا یوم الصبیحة تتعب
ریح العبیر لکم ونحن عبیرنا　　رهج السنابك والغبار الاطیب
ولقد اتانا من مقال نبینا　　قول صحیح صادق لا یکذب
لا یستوی غبار خیل الله فی　　انف امرئ ودخان نار تلهب
هذا کتاب الله ینطق بیننا　　لیس الشهید بمیت لا یکذب

جہاد سے آپ کی وابستگی مندرجہ بالا اشعار کے ... سے جھلکتی ہے۔ اس فن کے ماہروں آپ نے اُن احادیث و روایات کو اکٹھا کر دیا جن سے جہاد کی عظمت اور ضرورت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کو کتاب الجہاد کے نام سے موسوم کیا۔ بغدادی، حاجی خلیفہ، بروکلمان اور جعفر الکتانی نے اپنی اپنی کتب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابوبکر محمد بن خلیفہ الاموی نے اپنی کتاب فہرست ما رواہ عن شیوخہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے سندِ روایت کے سلسلوں کو ذکر کیا ہے۔ یہاں اس کا کتاب فضل الجہاد کے نام سے ذکر ملتا ہے۔ لائبزگ (المانیا) کے کتب خانہ میں نمبر ۳۲۰ کے تحت اس کا مخطوطہ ملتا ہے اس مخطوطہ کے ۴۰ اوراق ہیں۔ پانچویں صدی ہجری میں یا اس سے قبل کے کسی زمانہ میں لکھا گیا۔ اس کو تین بار سنایا گیا۔ پہلی دو سماعتیں ۴۶۲ھ میں اور تیسری سماعت ۴۶۳ھ میں ہوئی۔ مخطوطہ دو جز میں روایت کا سلسلہ یہ ہے۔

روایت ابراہیم بن محمد عبداللہ الجلی نے محمد بن سفیان سے انہوں نے سعید بن رحمۃ سے انہوں نے ابوالحسین محمد بن احمد بن محمد الآبنوسی الصیرفی سے کی ہے اور ان سے ابوعلی حسین بن محمد البلخی نے سماعت کی۔

مخطوطہ خطی نسخہ میں ہے جس کو جامعہ بغداد کے ممتاز محقق استاد جناب نزیہ حماد کی ضروری تحقیق و تعلیق کے ساتھ بیروت سے ۱۳۹۱ھ میں شائع کر دیا گیا ہے۔

کتاب البرّ والصّلہ :

اس کتاب کا ذکر ہدیۃ العارفین، الفہرست اور رسالۃ المستطرفہ میں کیا گیا ہے لیکن اپنے حال اور وجود کے اعتبار سے آج کل معدوم ہے۔ جعفر الکتانی نے اسے احادیث

کی ان کتابوں کے ذیل میں درج کیا جو کسی مخصوص باب سے متعلق ہیں ۔ ؎

کتاب التاریخ :۔

اس کتاب کو بغدادی نے ہدیۃ العارفین میں اور ابن ندیم نے الفہرست میں حضرت عبداللہ بن مبارک سے منسوب کیا ۔ لیکن اس کے مندرجات اور وجود کے بارے میں کہیں سے کوئی خبر نہیں ملتی ۔

کتاب الاستئذان :۔

جناب جعفر الکتانی نے احادیث کی مخصوص باب سے متعلق کتب میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا اور کسی تذکرہ نگار کے ہاں وجود نہیں ملتا ۔ یہ بھی مفقود الوجود ہے جس کی وجہ سے اس کے مندرجات کا اس سے زیادہ پتہ نہیں دیا جاسکتا ۔

حضرت عبداللہ بن مبارک ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مطلقاً حدیث کو سب سے پہلے جمع کرنا شروع کیا ۔ جناب زکریا انصاری کا ایک قول عراقی کے الفیہ کی شرح میں وارد ہے کہ سب سے پہلے مطلقاً جن لوگوں نے احادیث کو جمع کیا ۔ وہ مکہ میں ابن جریج مدینہ میں امام مالک اور ابن ابی ذئب شام میں اوزاعی ، کوفہ میں امام ثوری ، بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ ، ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ یمن میں معمر بن راشد اور خالد بن جمیل ، رے میں جریر بن عبدالحمید اور خراساں میں عبداللہ بن مبارک ہیں ۔

اس کے بعد امام جعفر الکتانی تدریب الراوی کے ایک قول کو نقل کرتے ہیں ۔

"سب سے پہلے ان کو یعنی آثار کو جمع کرنے والے مکہ سے ابن جریج ، ابن اسحٰق اور امام مالک مدینہ سے ، ربیع بن صبیح سعید بن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ بصرہ سے ، کوفہ سے سفیان ثوری ، شام سے اوزاعی ، واسط سے ہشیم یمن سے معمر ، رے سے جریر بن عبدالحمید ، اور خراسان سے ابن المبارک ہیں ۔

مندرجہ بالا دونوں روایات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے بارے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مطلقاً حدیث کو ان لوگوں نے جمع کیا ۔ جس میں نہ تو ابواب کی تخصیص کی گئی اور نہ ہی کسی دوسری صنف کو سامنے رکھا گیا

؎ جعفر الکتانی : الرسالۃ المستطرفہ : ۴۳ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء

حافظ ابن حجر اور عراقی کے خیال میں یہ جملہ لوگ ہم عصر تھے اس لئے کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلے آثار کو کس نے جمع کیا، جناب عبدالصمد صارم نے اپنی کتاب "تاریخ الحدیث" میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی تصنیف اربعین کو اس دور کی اپنی صنف اربعینیت کے اعتبار سے پہلی کتاب قرار دیا ہے[1] جس میں ابواب اور مسانید کی کوئی قید نہ تھی۔ جبکہ آپکی زیادہ تر کتب مخصوص ابواب پر تھیں جن کا پہلے تعارف کرایا جا چکا ہے۔

شعری خدمات

حضرت عبداللہ بن مبارک کو اللہ تعالیٰ نے دیگر صلاحیتوں کے ساتھ شاعرانہ کمالات سے بھی نوازا تھا۔ آپ ایک باذوق اور موزوں طبیعت کے مالک تھے۔ آپکے ہاں پیشہ دارانہ شاعروں کی طرح آورد نہیں تھی بلکہ اپنی ذوقیت اور موزونیت کی فطری صلاحیتوں کی وجہ سے شعر آپ کی زبان سے خود بخود نکلتے تھے۔ جو رنگ آپ کے کردار اور افکار سے جھلکتا ہے وہی رنگ آپ کے شعروں میں ملتا ہے۔ شعر آپ کے جذبات اور احساسات کے ترجمان تھے۔ اس لئے آپ کا کلام آپکے کردار، افکار، جذبات اور احساسات کا آئینہ ہے۔ آپ کی شاعری پر ایمان و ایقان، دعوت و ارشاد اور تعمیری و اصلاحی تنقید کا رنگ غالب ہے۔ آپنے بعض علماء کے محاسن کو بھی اپنے شعروں میں بیان کیا ہے جس سے آپ کے احساسات مترشح ہوتے ہیں۔

آپ کے شعروں میں کمال کا ایجاز و اختصار پایا جاتا ہے۔ اور اس طرح اشعار میں تنقید و تعریف، دعوت و تعلیم اور ترہیب و ترغیب کو بڑے لطیف اور حسین ادبی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ کے شعروں کی ایک اور نمایاں خوبی اعتدال اور حقیقت بیانی ہے۔ شعروں میں کسی قسم کی کوئی مبالغہ آرائی نہیں ملتی۔ جو آپ نے دیکھا یا محسوس کیا وہی کچھ بیان کیا اور بڑے بے لاگ اور جرأت مندانہ انداز میں بیان کیا۔ جس سے آپ کی شاعرانہ حیثیت میں وہ تمام کمالات آجاتے ہیں جو ایک مسلمان شاعر میں ہونے چاہئیں۔ آپ کی شاعری سے آپ کی محدثانہ حیثیت جہاں ایک ایک لفظ اور ایک ایک عمل کو پرکھا اور جانچا جاتا

---

[1] عبدالصمد صارم: تاریخ الحدیث: ۶۳ مطبوعہ لاہور ۱۳۵۴ھ

ہے جس قسم کے کلام کا شکار نہیں ہوتی - اس طرح آپ کے شعری اور نثری خزانے اسلامی ادب کا گراں قدر قیمتی سرمایہ ہیں - ذیل میں ہم آپ کے بکھرے ہوئے کلام کو ترتیب سے جمع کرتے ہیں

۱ - بحر بسیط

يا طالب العلم باشر الورعا — وهاجر النوم واهجر الشبعا

يا ايها الناس انتم عشب — يحصدكم الموت كلما طلعا

لا يحصد الناس عند ذائقته — الا الذي في حياته زرعا [1]

ترجمہ : اے طالب علم پرہیزگاری میں سبقت کر، نیند سے علیحدگی اختیار کر اور شکم پروری سے اجتناب کر لے۔

اے لوگو تم اس سبز گھاس کی طرح ہو جس وقت سر ابھارتی ہے موت اسے کاٹ دیتی ہے۔

آدمی موت کے بعد کچھ نہیں کاٹتا مگر وہی کچھ جو اس نے اپنی زندگی میں بویا ہوتا ہے۔

۲ - اری اناسا بادنی الدین قد قنعوا — ولا اراهم رضوا بالعيش بالدون

فاستغن بالدين عن دنيا الملوك كما — استغنى الملوك بدنياهم عن الدين [2]

قد يفتح المرء حانوتا لمتجره — وقد فتحت لك الحانوت بالدين

بين الاساطين حانوت بلا غلق — تبتاع بالدين اموال المساكين

صيرت دينك شاهينا تصيد به — وليس يفلح اصحاب الشواهين [3]

ترجمہ : میں ایک بڑے گروہ کو دیکھ رہا ہوں جو اس دین میں ڈوب گیا جس کو انہوں نے مانگا تھا اور میں ان کو اس کے بغیر اپنی زندگی سے خوش ہوتے نہیں دیکھتا۔

پس آپ بادشاہوں کی دنیا کے مقابلہ میں اپنے دین سے قوت حاصل کریں جس طرح کہ بادشاہ دین سے اپنی دنیا کی وجہ سے مستغنی ہو گئے۔

ہر آدمی جیسے اپنی تجارت کے لئے دکان کھولتا ہے آپ نے بھی ایسے ہی دین کی

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ : ۱ : ۱۹۲

[2] کتاب الورقہ : ۱۴

[3] ابوالطیب قنوجی : تاج المکلل : ۵۸

اپنے لئے دکان کھول لی ہے ۔

و چنانچہ دو ستونوں کے درمیان بغیر تالہ لگی دکان کھل گئی ہے جہاں مساکین کے مول کو دین رکھنے کے ساتھ فروخت کیا جاتا ہے ۔

و نیز اس شاہین کی طرح ہو گیا ہے جس سے شکار کیا جاتا ہے ۔ اور اصحاب الشواہین کے لئے فلاح نہیں ہے ۔

جب آپ مکہ جانے لگے تو آپ نے یہ شعر کہے (تاریخ بغداد: ۱۰ : ۱۶۶)

بغض الحیاۃ وخوف اللہ اخرجنی ۔۔۔ وبیع نفسی بما لیست لہ ثمنا

انی وزنت الذی یبقی لیعدلہ ۔۔۔ ما لیس فلا واللہ ما اتزنا

دنیا کی زندگی سے نفرت اور اللہ کے خوف نے مجھے (جہاد کے لئے) نکالا ۔ اور اپنے نفس کی فروخت نے جس کی کوئی قیمت نہیں ۔ میں نے باقی رہنے والی چیز کا اندازہ لگانے کے لئے اس کو تولا تو وہ کچھ نہ نکلا پس نہیں خدا کی قسم ہم نے تل کر نہیں دیکھا ۔

بحر خفیف

ان تلبست عن سؤالك عبداللہ ۔۔۔ ترجع عذا یخفی حنین

فاعتنت الشیخ بالسؤال تجدہ ۔۔۔ سلسا یلتقیك بالراحتین

واذا لم تصح صیاح الثکالی ۔۔۔ قمت عنه وانت صفر الیدین[۱]

بحر رمل :-

۱ - آخر العلم لذیذ طعمه ۔۔۔ وبدی الذوق منه كالصبر[۲]

ترجمہ علم کا آخر لذیذ ہے جبکہ اس کی ابتداء کا ذائقہ صبر کی طرح کڑوا ہے ۔

۲ - ایها الناسك الذی لبس الصو ۔۔۔ ف واضحی یعدنی العباد

الزم الثغر والتعبد فیه ۔۔۔ لیس بغداد مسكن الزهاد

---

[۱] انبار الرواۃ علی انباہ النحاۃ : ۱ : ۳۴۷

[۲] جامع بیان العلم وفضلہ : ۱ : ۹۰

[۳] جامع البیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر : ۱ : ۹۰

ان بغداد للملوک محل   ومناخ للقاری الصیادٌ

ترجمہ : اے عباؤں پہننے والے اور چاشت میں داخل ہونے والے عبادت گزاری کے اندر تو وعدہ کرتا ہے ۔ تو ملکی سرحدوں کو ٹھکانہ بنا لے اور وہیں عبادت کر۔ بغداد ، زاہد لوگوں کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ۔ بے شک بغداد بادشاہوں کی اور صیاد فطرت عابدوں کی آماجگاہ ہے ۔

۲ - زعموها سألت جاراتها   وتعرت ذات يوم تتبرد

أكما ينعتني تبصرنني   عمركن الله أم لا يقتصد

فتضاحكن وقد قلن لها   حسن في كل عين من تود

حسداً حملنه من شأنها   وقديماً كان في الناس الحسد

ترجمہ : لوگ اس کو یا جانتے ہیں جس عورت نے اپنی ہمجولیوں سے پوچھا ، اسے اس کا اپنا پتہ چلتا ہے جب کبھی وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتی ہے ۔

جس طرح خون کی سُرخی نے مجھے ڈھانپ لیا ہے جس کو تم عورتیں بڑے متجسس انداز میں دیکھ رہی ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی اسی طرح بنایا ہے ۔ تم اس سے نفع اندوز کیوں نہیں ہوتیں ۔

وہ سب ہنس پڑیں اور اسے کہنے لگیں ۔ حسن ہر اس آنکھ میں ہوتا ہے جو محبت کرتی ہے ۔ اس کے رویہ سے وہ سب حسد کرنے لگیں اور یہ بہت پرانی بات ہے کہ تعجب خیز چیز پر حسد ہوتا ہے ۔

---

۲ ابن عبد ربہ اندلسی : العقد الفرید : ۵ : ۲۶۰

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں
خود بھی مطالعہ کیجئے اور اسے پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے
ہدیہ فی نسخہ تین روپے تبلیغی مقصد کے لیے یکمشت خریدنے پر ۳۳ فی صد رعایت دیا جائے گا

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : سندھ کے حالات کی سچی تصویر
مصنف : محمد موسیٰ بھٹو
مطبوعہ : سندھ نیشنل اکیڈمی، حیدرآباد
قیمت : ۱۵ روپے

حال ہی میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اندرون سندھ کا ایک دورہ کیا ہے اور اس کی تفصیلی رپورٹ جون ۱۹۸۶ء کے ماہ نامہ میثاق میں شائع ہو چکی ہے اس دورے کی رپورٹ نے ہر محب وطن پاکستانی کو مضطرب اور بے چین کر دیا ہے کہ آخر اندرون سندھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی تفاصیل اور تجزیے سے اہل پنجاب کو کیوں بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ اور سندھ میں حالات کے اس حد تک خطرناک ہونے کے باوجود ہماری حکومت اس قدر بے حسی کا شکار کیوں ہے؟ ضرورت اس امر کی تھی کہ سندھ کا رہنے والا کوئی محب وطن پاکستانی اس موضوع پر قلم اٹھاتا اور اہل پاکستان کو ان حالات اور اسباب سے کلی طور پر آگاہ کرتا جو سندھ کو اس خطرناک موڑ تک لے آئے ہیں۔ جناب محمد موسیٰ بھٹو نے "سندھ کے حالات کی سچی تصویر" کے نام سے اپنی کتاب میں ان اسباب و واقعات کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ جو سندھ کو اس خطرناک حد تک لے آئے ہیں کہ وہاں کھلم کھلا "پاکستان توڑ دو" کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ معاملہ صرف پنجاب سے نفرت کی حد تک نہیں بلکہ اسلام اور مشاہیر اسلام سے بیزاری تک جا پہنچا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ یہی جذبہ مزید ترقی کر کے ارتداد تک نہ پہنچ جائے۔

ان حالات کی موجودگی میں زیر تبصرہ کتاب اور اسی قسم کی دیگر کتب کا مطالعہ اور پنجاب میں ایسی کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرنا محب وطن کا

ایک اہم تقاضا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اندرون سندھ غیر سیاسی سطح پر لٹریچر کے ذریعے ثقافتی اور دینی سطح پر مثبت کام کیا جائے، سندھی نوجوانوں کے دینی جذبے کی آب یاری کی جائے اور ایسے اداروں سے عملی تعاون کیا جائے جو صحیح نہج پر دین اور وطن کی خدمت کر رہے ہیں۔

(۲)

نام کتاب : شاہنامہ بالاکوٹ منظوم (حصہ اوّل)
شاعر : علیم ناصر

ملنے کا پتہ : مکتبہ علیمیہ ۲۴/سی نصیر آباد شالامار ٹاؤن لاہور نمبر ۹

برعظیم ہند و پاک کی عظیم الشان دینی تحریک، تحریک مجاہدین ہے جس کی فکری قیادت امام ولی اللہ دہلوی کے خاندان کے اکابر علماء نے کی تو عملی قیادت اسی خانوادہ کے فیض یافتہ اور رائے بریلی کے مشہور سادات کے چشم و چراغ حضرت سید احمد بریلوی نے اجن کے دست راست مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڈھانوی جیسے حضرات تھے۔ اس تحریک نے نہ صرف اپنے دور میں اصلاحِ احوال کی عظیم خدمات سرانجام دیں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس سے براہ راست اور بالواسطہ فیض پانے والوں نے زبردست رول ادا کیا تھا کہ اب تک اس وسیع خطہ میں اصلاحی تحریکوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح اسی تحریک سے ہے۔ اس تحریک سے متعلق مختلف زبانوں میں اچھا خاصا لٹریچر آچکا ہے جس میں مولانا غلام رسول مہر کا علمی کام ایک دائرۃ المعارف کا حکم رکھتا ہے۔ جبکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر قیام الدین پٹنہ وغیرہ کا کام بھی بڑا وقیع ہے۔ ابھی حال ہی میں محترم علیم ناصری صاحب کا یہ شاہکار نثر نہیں نظم کے لباس میں آیا ہے۔ موصوف کی نثری صلاحیت کے تو ہم معترف تھے نظم کے معاملہ میں ہمارا ایسا خیال نہ تھا لیکن اس کتاب نے ہمیں حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اس کا مقدمہ محترم علی میاں نے لکھا۔ انہوں نے حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کا حوالہ دے کر علیم صاحب کو ان کا جانشین بتلایا اور اپنا تاثر اس طرح لکھا کہ:

ان کے "شاہنامہ بالاکوٹ" عہد حاضر کے ایک اچھے اسلامی رزمیہ کی شان

پیدا کر دی ہے جس کو پڑھتے ہوئے آنکھیں بھی نم ہوتی ہیں اور دلوں میں حرکت و حرارت بھی محسوس ہوتی ہے اور یہ کسی ادبی شاہکار کی کامیابی کی ایک بڑی دلیل اور کھلا ثبوت ہے۔

جبکہ مرحوم سید عبداللہ نے "حقیقت نگاری" کے عنوان سے مختصر اظہار خیال کیا اور علیم صاحب کی اس کاوش کو بہت سراہا اور لکھا کہ

جو دینی جذبہ علیم ناصری کے شاہ نامہ بالاکوٹ میں ہے وہ کسی اور جگہ شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہوگا۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب نے اسے بے حد سراہا اور دعا کی کہ دوسرا حصہ اسی شان سے آئے۔ پہلا حصہ ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے جو سید صاحب کی ابتدائی ترکتازیوں سے لے کر معرکہ اکوڑہ خٹک تک پر مشتمل ہے اور سچی بات ہے کہ اس نے ہمیں کئی بار رلایا اور دل میں کدگدی پیدا کی اور ہم دعا کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ایسا موقع کبھی ہمیں بھی فراہم کریں کہ اپنی جان ہتھیلی پر لے کر اس کی راہ میں نکلیں اس شعری مجموعہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت وقت کی ضرورت ہے۔ (س۔ع)

(۳)

نام کتاب : پاکستان میں تعلیم و تدریس : "مسائل و مشکلات اور ان کا حل"
ناشر : گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی

۵۳۶ صفحات کا یہ مجموعہ درحقیقت گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کا علمی مجلّہ ہے جو اس کالج کے علم دوست پرنسپل پروفیسر سید امتیاز صاحب کے دور ملازمت کی آخری علمی کاوش ہے، موصوف کے دور میں اس کالج کے مجلّہ نے کئی ایک یادگاری نمبر نکالے جو پاک و ہند کے علمی اداروں اور بعض شخصیات کے حوالہ سے بڑے اہم ہیں اور ملک کے ارباب ذوق نے انہیں بہت پسند کیا۔ اس مجلّہ کے مرتبین میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری سمیت کالج کے ۴ دوسرے اساتذہ بھی شامل ہیں جنہوں نے بڑی لگن، محنت اور خلوص سے اسے مرتب کیا۔ اس مجلہ کو افکار و مسائل، مسائل و مباحث، مباحث و افکار، اصلاح و معیار استاذ مقام و مسائل، آئندہ کی تجاویز، امتحان اور انتظامیہ کے عنوانات سے تقسیم کر کے ہر موضوع کے ضمن میں کم و بیش ۵، ۶ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو موضوع کی مناسبت

کے اعتبار سے بڑے اہم اور مفصل ہونے کے ساتھ ساتھ متعلقہ مسئلہ کا خوب احاطہ کرتے ہیں۔ مضامین نگار ملک بھر کی جامعات، کالجز اور عربی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے اپنے میدان میں مہارت تامہ کے حامل ہیں کسی ملک و قوم کے لئے تعلیم ریڑھ کی ہڈی یا دل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی اصلاح ہی سے ملک قوم کی تعمیر و ترقی کا صحیح کام ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسا نہیں۔ ایسے ماحول میں اس کالج نے یہ خصوصی مجلہ شائع کر کے احسان کیا ہے، امید کہ اس کے ٹھوس، جاندار اور مدلل مقالات سے تعلیمی اصلاح و ترقی کے لئے بھرپور فائدہ اٹھایا جائیگا اور کالج کی نئی انتظامیہ اس سلسلۂ خیر کو جاری رکھ کر اپنی نیک نامی میں اضافہ کرے گی۔

(۴)

نام کتاب : پاکستان اسٹیٹ آئل ریویو (خصوصی سیرت نمبر)
ناشر : پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ - پی او بکس ۳۹۸۳ - کراچی۔

پی ایس او پاکستان میں تیل سپلائی کرنے والا ایک عظیم ادارہ ہے جو کہ خالصتہً تجارتی بنیادوں پر کام کرتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ یہ ادارہ اپنے ہاں سے جو پرچہ نکالتا ہے اس کا ایک سیرت نمبر بھی بالالتزام ۱۹۷۹ء سے چھپ رہا ہے۔ اور ہر سال ایک خصوصی شمارہ اس عنوان سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ۱۹۸۴ء میں مصباح الدین شکیل صاحب کا مضمون۔ "سیرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم : ولادت سے غار حرا تک" شائع کیا جو کہ اپنی مثال آپ تھا۔ دوسرا حصہ "غار حرا سے ہجرت حبشہ تک" ہمارے سامنے ہے جو کہ ٹائٹل صفحات کے علاوہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا سائز ۸½ × ۱۱" ہے کتاب بہت عمدہ ہے مضامین کی ترتیب بھی مثالی ہے۔ معلومات بھی بہت خوبصورتی اور تحقیق سے جمع کی گئی ہیں۔ حسب و نسب کے خاکوں اور علاقوں نقشوں نے اس پرچے کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے خاتم النبیین سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری میں اس ادارے نے ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

البتہ آخر میں ایک گذارش کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جس طرح کتابیات

کا التزام کیا گیا ہے اس طرح ہر واقعہ کا حوالہ بھی درج کرنا اشد ضروری ہے۔ تاکہ یہ کتاب یا شمارہ عامۃ الناس کے فائدے سے بڑھ کر اہل تحقیق و جستجو کی رہنمائی کا ذریعہ بھی بن جائے۔ امید ہے کہ ادارہ ان [illegible] اور میری طرف سے مبارک باد قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اس [illegible] فرمائے گا۔

(۵)

نام کتاب : دعوت فکر و عمل مصنف : ابو الاقم انصاری

۶۰ صفحات کا یہ رسالہ ابو الارقم انصاری کے قلم سے ہے جس کا ترجمہ محمود احمد صاحب نے کیا اور حزب الرسول ۱/۹۴ [illegible] بلاک ای سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی نے چھاپا اس میں درحقیقت ایران، اسرائیل اور شیعیت و صہونیت کے مابین تعلقات و روابط پر ٹھوس دلائل کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ صہونیت اسلام کی ازلی دشمن ہے اور شیعیت اس کا دوسرا روپ ہے، آجکل ایران سے اسرائیل تک مسلم دنیا کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ آپ کو اس رسالہ سے ہوگا۔ جس کی بکثرت اشاعت کی ہم سفارش کرتے ہیں، امید ہے کہ وہ لوگ جو ایرانی انقلاب پر اسلامیت کا لیبل لگا کر اسے سراہتے ہیں ان کی آنکھیں بھی اس سے کھل کر رہیں گی۔

(۶)

نام کتاب : شیعہ حضرات کی اسلام سے بغاوت
مصنف : قاری اظہر ندیم

قاری اظہر ندیم ایک مخلص نوجوان ہیں ہلکا پھلکا لٹریچر بالعموم چھاپتے رہتے ہیں مقاصد تبلیغ ہوتی ہے اسلئے واجبی قیمت سے رسائل تقسیم کرتے ہیں اس ۴۰ صفحہ کے رسالہ میں شیعہ عمائدین کی کتب سے ان کے افکار و اعتقادات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ اصل حوالے زیادہ ہیں اور تبصرہ کم، تاکہ مصروف قاری جلدی سے شیعیت کو سمجھ لے — ہم اس رسالہ کی بکثرت اشاعت کی توقع رکھتے ہیں۔ ملنے کا پتہ : عامر اکیڈمی زیلدار روڈ اچھرہ - لاہور

سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں ۲ دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدرِ مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

رسولِ کاملؐ

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسولؐ

سورۂ احزاب رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل - نزد آرام باغ، کراچی ۱ ، فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 5 | SEPTEMBER 1986 | No. 9

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ